انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد: ۱، شمارہ: ۱۱، جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء / ربیع الآخر تا رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	پروفیسر توقیر عالم فلاحی	۵
ترانۂ فلاح: تلاش وتعبیر (۲)	ڈاکٹر امتیاز وحید	۲۳
اسلامی فلسفۂ تعلیم اور استاذ وشاگرد کا رشتہ	انعام اللہ فلاحی	۳۲
ہمارے زمانے کا جامعہ	طیب حسن فلاحی	۴۵
تحفظ شریعت اور علماء کی ذمہ داریاں	ابوالمکارم فلاحی ازہری، عبدالحق فلاحی، پروفیسر محمد اسحاق، محمد اسماعیل فلاحی، عبدالرحیم قریشی، ذوالفقار علی فلاحی، سراج حبیب فلاحی، محمد اکمل فلاحی، عبدالحاکم مجاہد فلاحی	۵۴ تا ۸۱
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۰)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۸۲
محمد بن عبدالوہاب نجدی۔ایک مظلوم۔۔	محمد محفوظ فلاحی	۹۴
اسلامی ادب سے کیا مراد ہے؟	ظفر احمد اثری	۱۰۶
مشاہیر کے خطوط	رضوان احمد فلاحی	۱۰۹
شعر ونغمہ	سید راشد حامدی، عارف آئی، عزیز نبیل	۱۲۸
تعارف وتبصرہ	ڈاکٹر وارث مظہری، سعید اختر اعظمی	۱۳۱
آپ کے خطوط	قارئین	۱۳۵
جامعہ کے لیل ونہار واخبار انجمن	مصباح الباری فلاحی	۱۳۸

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اداریہ

اپنی بات

ملت اسلامیہ ہند کے معروف ترین تعلیمی اداروں کے بنیادی اغراض ومقاصد میں فریضۂ دعوت وتبلیغ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔ دارالعلوم دیوبند ملک کا قدیم ترین اور عظیم ترین دینی تعلیمی ادارہ ہے، آج دارالعلوم سے وابستہ ہزاروں مکاتب اور مدارس ملک میں دینی تعلیم کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں، اس کے دستور اساسی میں دارالعلوم کے قیام کے مقاصد کے تحت دعوت وتبلیغ کا خصوصی ذکر موجود ہے:

''قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا، مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا اور رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر وتقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔''

دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند کے بعد ملک کا معروف ترین دینی تعلیمی ادارہ ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء ''قدیم صالح اور جدید نافع'' کے عزم کے ساتھ اس خلا کو پر کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا جو دینی اور عصری تعلیم کے نام پر پیدا ہوگیا تھا، ندوۃ کی تاسیس کے وقت بھی دین کی اشاعت وتبلیغ کا مقصد واضح طور سے پیش نظر تھا۔ تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول صفحہ ۹۴ ؍ پر تحریک ندوۃ العلماء کی تاسیس کے مقاصد کے تحت مذکور ہے کہ

''ندوۃ العلماء نے ابتداء ہی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ ایسے علماء اور مبلغین پیدا کیے جائیں جن میں سادگی، جفاکشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں۔

اشاعت اسلام کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے۔ تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ مستقل واعظ مقرر کیے جائیں جو دیہات میں جا کر ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دی جائے۔''

جامعہ سلفیہ (بنارس) جمعیت اہل حدیث کی کوششوں سے قائم کیا گیا، جامعہ کی ویب سائٹ پر جامعہ کی تاسیس کے وہ اسباب بیان کیے گئے ہیں جنہوں نے جمعیت اہل حدیث کے علماء کو اس جامعہ کی تاسیس پر آمادہ کیا، اس میں سرفہرست درج ہے:

''اسلامی دعوت کی نشر واشاعت کی شدید ضرورت۔''

جامعۃ الفلاح کے قیام کا فیصلہ مدارس اسلامیہ ہند کی تاریخ کا ایک انقلابی فیصلہ تھا۔ اس کی تاسیس ان افراد

کے ذریعہ عمل میں آئی تھی جو ایک ایسی تحریک سے وابستہ تھے جس کی پہچان ہی دعوت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ تھی۔ چنانچہ جامعہ کے دستور میں اغراض ومقاصد کے تحت درج ہے کہ

''جامعہ کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہوکر وسعتِ قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔''

اسی طرح دیگر مدارس اسلامیہ کا جائزہ لے کر دیکھا جا سکتا ہے، معلوم ہوگا کہ دعوت وتبلیغ کا کام ان کی تاسیس کے بنیادی مقاصد میں ترجیحی طور پر شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملت کے تعلیمی اداروں کے اہداف ومقاصد میں دعوت دین اور تبلیغ دین کے اس قدر واضح اعتراف کے باوجود دعوت دین کا کام مدارس اسلامیہ اور اس کے فارغین کی پہچان کیوں نہیں بن پا رہا ہے؟

تعلیمی ادارے کسی بھی معاشرے کی ذہن سازی کرنے یا اس کو ایک رُخ دینے کا کام کرتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ ہند کی خاص بات یہ ہے کہ یہ خالصتاً ملت کی تعلیمی ضرورت پوری کرنے کے لیے قائم ہوئے ہیں، چنانچہ نونہالانِ ملت ہی اس میں داخلہ لیتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں، برادرانِ وطن نہ تو مدارس میں داخلہ لیتے ہیں اور نہ ان کے داخلہ کے لیے عموماً وہاں کوئی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مدارس اسلامیہ اگر دعوت دین اور تبلیغ دین کو کسی قدر اہمیت دیتے ہیں تو وہ مسلم معاشرہ کا مزاج دعوتی بنانے میں اس قدر ناکام کیوں ہیں، دعوت دین کے کام سے ملت اسلامیہ ہند اس قدر نامانوس کیوں نظر آتی ہے؟

دعوت دین ایک ایسا نکتہ ہے جس پر تمام ہی مکاتب فکر اور مسالک کے مدارس متفق ہو سکتے ہیں، اور اگر اس رُخ پر کام کو آگے بڑھایا جائے تو مدارس اسلامیہ کی افادیت میں غیر معمولی حد تک اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کی جانب بھی امت کو متوجہ کیا جا سکتا ہے جو امت کا فریضہ منصبی ہے اور اس کی انفرادی واجتماعی ہر دو لحاظ سے پہچان ہے اور جس کے لیے بارگاہ خداوندی میں انفرادی واجتماعی ہر دو سطح پر جوابدہ ہونا پڑے گا۔

اس پہلو سے اگر کام کو آگے بڑھایا جائے تو مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام کا از سر نو جائزہ لینا پڑے گا، اور دعوتی مقاصد کے تحت اس میں غیر معمولی حد تک حذف واضافہ سے کام لینا پڑے گا۔ درسیات کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں بھی دعوتی کام کی مشق پر توجہ دینی ہوگی۔

اس سلسلے میں مدارس اسلامیہ کے ایک وفاق کی تشکیل ضروری ہے، جو مسالک اور مکاتب فکر سے اوپر اٹھ کر دعوتی محاذ کی جانب مدارس کو متوجہ کرے۔ یہ کام مشکل ہے لیکن ازحد ضروری ہے، اس کے لیے سنجیدگی سے غور وفکر کرنے اور ایک ٹھوس لائحہ عمل مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ابوالاعلی سید سبحانی

فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

پروفیسر توقیر عالم فلاحی،
صدر شعبۂ دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تمام انبیاء کرام ایک ہی دین کے پیروکار تھے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے نوع انسانی کو عطا کی گئی نعمتیں دو قسم کی ہیں۔ ہوا، پانی، مٹی، آگ، پیڑ پودے اور دیگر تمام وہ چیزیں جن کے استعمال سے جسمانی نشو ونما ہوتی ہے، انھیں مادّی نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ رب السماوات والارض کی طرف سے ایک دوسری نعمت بھی عطا کی گئی ہے اور یہ نعمت ایسی ہے کہ اس کے استعمال سے آدم وحوا کی تمام اولاد کو انسان بن کر رہنے کا سلیقہ آتا ہے اور جو اس زندگی کے بعد اصل اور حقیقی زندگی کے ابدی شرف وسعادت اور فلاح وکامرانی کا ضامن بھی بنتا ہے۔ اس نعمت کو روحانی نعمت سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس روحانی نعمت کو دین اور مذہب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس پوری دنیا کا خالق اور مالک اگر ایک ہے اور بلاشبہہ ایک ہے، تو اس کا دیا گیا ضابطۂ زندگی (Code of life) اور اس ضابطۂ زندگی کا منشور (Manifesto) بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور سچ تو یہ ہے کہ دین و مذہب کے لحاظ سے اصلاً تمام انسان ایک ہی مسلک حیات کے پابند اور ایک ہی طریقۂ زندگی کے علمبردار تھے۔ خود نمائی کا جذبہ، تکبر اور ضد وہٹ دھرمی، دراصل وہ اسباب رہے ہیں جن کی بنا پر لوگ الگ الگ دین و مذہب کے علمبردار ہو گئے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس سلسلے میں واضح ہے:

> [(ابتداء میں) لوگ ایک ہی طریقے پر تھے پھر (آپس میں اختلافات رونما ہونے کے بعد) اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف انہی لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایت پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ

وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جولوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انھیں اللہ نے اپنے اِذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا(۱)۔]

گویا اللہ رب العزت نے جب انسان کو پیدا کیا تو اس کی ہدایت کا انتظام بھی کیا تا کہ دنیا کے اس امتحان گاہ میں ایک کامیاب امتحان دہندہ کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہوئے اپنی اس چندروزہ زندگی کو بھی کامیاب بنالے اور موت کے بعد کی ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے توشہ راہ تیار کرلے۔ وقت کے تمام انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار رہے اور انبیاء کی امتوں میں ظلم وجور اور ضد وہٹ دھرمی کی بناپر ہی دین ومذہب کے سلسلے میں اختلاف رونما ہوا۔ اللہ رب العالمین کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

[اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں الگ الگ نہ ہوجاؤ............لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا اور اس بناپر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے(۲)]

مذکورہ بالا قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ ابتداءً ایک ہی مذہب یا نظام زندگی سب کے لیے متعین تھا جس کی دعوت ہر نبی نے اپنے اپنے وقت میں اپنی قوم کو دی اور یہی دین آپؐ لے کر آئے۔ آپ ﷺ کو یہ دین مکمل شکل میں اور پوری انسانی برادری کے لیے بطور نعمت عظمیٰ دینے کا اعلان قرآن مجید میں یوں ہوتا ہے:

[آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا(۳)]

بنی نوع انساں کے لیے فکرمندی اور امت مسلمہ کا فریضہ

اسلام کسی مخصوص گروہ یا جماعت کا مذہب نہیں ہے اور نہ ہی کسی محدود جغرافیائی خطے سے اس کا تعلق ہے، بلکہ یہ اللہ رب العزت کا مذہب ہے اور جغرافیائی حد بندیوں سے قطع نظر پوری دنیا کے انسانوں کا یہ مذہب ہے۔ بقول شاعر:

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

بنی نوع انساں کی اس عظیم ترین دولت کی امانت کا باران افراد کے کاندھوں پر رکھا گیا ہے جو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" کے انقلابی بول بول کر اللہ کے اس دین کا علم اٹھا لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان تمام افراد کو جو اس کلمۂ طیبہ کے ذریعہ اپنا رشتہ اللہ کے اس دین سے جوڑ لیتے ہیں، خیر امت (۴)، امت وسط (۵) اور شہداء علی الناس (۶) کے القاب سے نوازا گیا ہے۔

اسلام میں شخصی فلاح و کامرانی کا تصور نہیں ہے۔ افراد خانہ جس ڈگر پر چل رہے ہوں، اچھائیوں اور برائیوں کے ترک و اختیار میں معاشرہ جس سمت سفر میں رواں دواں ہو اور دنیا کے لوگوں کی جو روش ہو، ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے چاہے وہ عبادات میں فرائض کے ساتھ ساتھ سنن و نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہو، قرآن مجید کی تعلیمات پر انفرادی لحاظ سے حد کمال تک عمل پیرا ہو اور صدقات و خیرات میں بھی پیش پیش ہو یہاں تک کہ دنیا ایسے شخص کو متقی اور پرہیزگار ہونے کی سند دے دے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ اعزہ و اقارب، برادری و معاشرہ اور دنیا کے دیگر لوگوں کے لیے فکر مند نہ ہو اور عملی طور پر حسب استطاعت ان کی خیر و فلاح کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل نہ ہو تو ایسا شخص خیر امت، امت وسط اور شہداء علی الناس کے قرآنی خطابات کا مستحق ہی نہیں ہے، مزید برآں دوسروں کے لیے فکر مند نہ ہونے اور اسے عملی جامہ نہ پہنانے کی صورت میں خود اس کی بھی کامیابی کی حقیقت سراب (Meagre) سے زیادہ نہیں ہوتی۔

فریضۂ دعوت داعیانہ کردار اور حق العباد کی ادائیگی سے عبارت

آج انسانی برادری داعی اور مدعو گروہوں پر مشتمل ہے۔ امت مسلمہ کا ہر ہر فرد داعی ہے۔ اگر امت مجموعی حیثیت سے دعوت کا کام چھوڑ دے یا انفرادی حیثیت سے دعوت کے کام سے کوئی شخص کنارہ کش ہو جائے تو گویا وہ اصل زندگی سے محروم ہے۔ داعی چونکہ مدعو کے مقابلے میں زیادہ توجہ کا مرکز ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ مدعو کے مقابلے میں داعی کی پوزیشن ایک قائد کی سی ہوتی ہے، اس لیے داعیانہ منصب کو فراموش کر کے اور فریضۂ دعوت سے مجتنب ہو کر امت اپنے نمایاں وجود کو بھی مخدوش کر لیتی ہے۔

حقوق اللہ (Rights related with Allah) اور حقوق العباد (Rights related with mankind) یہی دو قسم کے حقوق کی ادائیگی کا نام دین داری ہے۔ اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ دین داری کے ہر پہلو کا سرا انہی دونوں حقوق میں سے کسی سے جاملتا ہے۔ اللہ کے بندوں کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اللہ کا دین جو اسلام کے ماننے والوں کے پاس ایک امانت کی

شکل میں موجود ہے، اسے معاشرے کے ان افراد تک اور دنیا کے ان لوگوں تک پہنچایا جائے جو اس نعمت گراں مایہ کی قدر سے نا آشنا اور رب العالمین کے دیے گئے ضابطۂ الٰہی سے محروم ہیں۔ دین اسلام کی اس نعمت کے محتاج اصلاً تو وہ ہیں جو اللہ کے دین کے قریب آتے ہی نہیں اور شعوری اور غیر شعوری طور پر انسانوں کے بنائے ہوئے ضابطۂ زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ حضرات بھی اللہ کے اس دین سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتے جو رسمی طور پر اس سے وابستہ ہو گئے ہوں، چنانچہ امت مسلمہ اس کام کے لیے مکلّف ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کیے گئے ضابطۂ زندگی کی شکل میں انسانوں کے عظیم الشان حق کو انسانیت کے حوالے کیا جائے اور اس طرح ایک بڑے حق العباد کی انجام دہی کا فریضہ انجام دیا جائے۔

اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا پوری دینداری ہے۔ امر بالمعروف (اچھائی کا حکم دینے) اور نہی عن المنکر (برائی سے روکنے) پر ہی صحیح معنوں میں اللہ کا دین مشتمل ہے۔ یعنی اچھائیوں کو اپنی زندگی کا زیور بنایا جائے اور دوسروں کی زندگیوں کو ان اچھائیوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کی جائے اور برائیوں سے بچا جائے اور دوسروں کو ان سے بچنے کی تلقین کی جائے، اسلام انہی ذمہ داریوں سے عبارت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے خود داعی کو براہ راست جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ دوسروں کو اچھائیوں کی دعوت دیتے رہنے اور برائیوں سے روکتے رہنے کے نتیجے میں اچھائیوں کا خوگر بننے اور برائیوں سے متنفر ہونے کی مشق ہوتی رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک پہرہ دار یا چوکیدار آواز لگا کر بستی اور محلے والوں کو بیدار رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود بھی بیدار رہتا ہے۔ ایک دوسرا فائدہ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر اس کی جدوجہد کے نتیجے میں اچھائیوں کی طرف راغب اور برائیوں سے متنفر معاشرہ کا وجود عمل میں آجاتا ہے تو وہ خود اور اس کے اہل وعیال کو ایک پاک صاف معاشرہ میسر آتا ہے جس میں وہ شاداں وفرحاں زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

معروفات اور حسنات سے محبت اور اہل معاشرہ اور اہل دنیا کو اپنی استطاعت کے مطابق ان کا گرویدہ کرنے کی کوشش کرنا اور اس کے برعکس منکرات وسیئات سے نفرت اور تا حد امکان افراد ومعاشرہ کو ان سے بچنے اور دور رکھنے کی تلقین کرنا دراصل ایمان لانے والوں کا خاصہ ہے۔ اس کے بالمقابل اچھائیوں اور نیکیوں سے بعد وتنفر اور ماحول ومعاشرۂ انسانی کو ان سے بعد وتنفر اختیار کرنے کی تلقین اور منکرات وفواحش سے قربت ومحبت اور ان کے فروغ واشاعت کی تعلیم منافقین کا کردار ہوتا

ہے۔قرآن مجید کی واضح تعلیمات جہاں مومنین ومنافقین کا فرق بتاتی ہیں، وہیں ان دونوں کے کردار کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔(۷)

چند بولوں پر مشتمل کلمہ طیبہ کے الفاظ کو خلوص و نیک نیتی (Sincerity) کے ساتھ ادا کرنے والا شخص اس امت کا ایک فرد ہو جاتا ہے جو انسانیت کی خیر خواہی اور نفع رسانی (Well-wishing and Well-doing) کے لیے منظر عام پر لائی گئی ہے، اور اس نیک و پاک مقصد کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اچھائیوں کو عام کرنے اور برائیوں کو روکنے کی کوشش کی جائے۔قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ دنیا کے تمام انسانوں میں امت مسلمہ کا امتیاز بھی بتاتی ہے اور اس کی ذمہ داریوں کی بھی وضاحت کرتی ہے۔

[تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے برپا کی گئی ہے،تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو(۸)]

اہم ترین معروفات اور منکرات

کائنات کا خالق و مالک ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔اس کی ذات میں، صفات میں اور اختیارات میں کسی دوسری مخلوق کو شریک کر لینا بہت بڑا جرم بلکہ ظلم عظیم ہے، جس کی معافی اللہ کی بارگاہ میں ہرگز نہیں ہے۔محمد عربی ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے آخری نبی ہیں جو پوری انسانیت کے لیے رحمت اور تمام دنیا والوں کے لیے اسوۂ حسنہ (Unparalleled Model) ہیں،قرآن مجید کتاب ہدایت ہے جو قیامت تک کے لیے محفوظ ومأمون اور پوری انسانی برادری کے لیے خدا کا آخری پیغام (Message) ہے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے، جس میں ہمہ وقت ہوشیار و بیدار رہنا چاہیے اس نتیجے کے لیے جس کا آغاز موت کی آخری ہچکی کے بعد ہی ہو جاتا ہے۔موت کے بعد کی زندگی ہی دراصل خیر اور باقی رہنے والی ہے۔اسی لیے اس زندگی کے لیے فکرمندی بھی ہونی چاہیے اور اسی کے حصول کے لیے مقابلہ ومسابقہ (Competition) بھی ہونا چاہیے۔والدین، اعزہ واقرباء، احباب ورفقاء اور معاشرے کے نادار ومحتاج افراد ہمارے حسن سلوک اور ہماری عنایتوں کے مستحق ہیں۔عدل وانصاف، مساوات ومواخات (Equality and Fraternity)، ہمدردی وغمگساری اور وہ تمام اوصاف جن کی بنا پر معاشرے میں امن وعدل اور اخوت ومحبت کا بول بالا ہو، یہ سب امر بالمعروف (Enjoining Good) کے موضوعات ومباحث ہیں جن کے فروغ واشاعت کی مبارک جدوجہد

امت مسلمہ کے فریضۂ منصبی کا ایک حصہ ہے۔

رب العالمین سے بے اعتنائی برت کر زندگی گزارنا یا انسانیت کی ہدایت کے لیے اللہ رب العالمین کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء کرام بالخصوص اس کے آخری نبی محمد عربی ﷺ کا انکار یا ان کے طریقے سے بغاوت، اسی چار روزہ زندگی کو اصل زندگی قرار دے کر اس کی رنگینیوں پر ریجھنا اور موت کے بعد ہمیشہ ہمیش کی زندگی کو بالائے طاق رکھ دینا، اللہ کی تمام بھیجی ہوئی کتابوں کا انکار اور پوری انسانی برادری کے لیے قرآن مجید کی شکل میں اس آخری اور عالمگیر ہدایت نامہ (Final and Universal Guidence) سے بے التفاتی و بے نیازی، والدین اور اعزہ واقارب کے ساتھ ساتھ معاشرۂ انسانی کے دیگر افراد کے حقوق کی ادائیگی سے بے توجہی، ظلم وعدوان اور دیگر فواحش ومنکرات کی بابت نرم گوشہ، یہ وہ اخلاق ذمیمہ اور اعمال فاسدہ ہیں جو کسی بھی معاشرے کے لیے زہر ہلاہل (Fatal Poision) ہیں۔ امت مسلمہ کے افراد حسب استطاعت اس کے مکلّف ہیں کہ ان سے معاشرے کو پاک کیا جائے۔ بہترین گروہ انسانیت ہونے کی حیثیت سے جو امت پر فریضہ عائد ہوتا ہے اس کا دوسرا پہلو یہی ہے کہ ان برائیوں کے لیے دل کی دنیا میں کوئی نرم گوشہ نہ ہو اور داعیانہ اضطراب و بے چینی کے ساتھ حکمت عملی (Practical Wisdom) کے اثاثہ کو زادِراہ بناتے ہوئے ان سے نبردآزما ہوا جائے۔

خاتم الانبیاءؐ کی بعثت مبارکہ کا مقصد:

خیر امت (The Best Group of the World) ہونے کی شرط اور ایمان کا تقاضا ہے کہ اچھائیوں کا نقیب وعلمبردار (Standard-bearer) بنا جائے اور برائیوں کے خلاف محاذ آرائی کی جائے۔ اللہ کے آخری نبی محمد عربی ﷺ کی بعثت مبارکہ کا مقصد ہی قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائیوں کی دعوت دے اور برائیوں سے روکے۔ نبی عربی کی بعثت کے اس مقصد کو قرآن مجید کی یہ آیت واشگاف کر دیتی ہے:

> [(اللہ کی رحمت ان لوگوں کے حصے میں ہے) جو اس پیغمبر، نبی امّی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے(۹)۔]

خاتم الانبیاءؐ کسی مخصوص طبقۂ انسانی اور کسی محدود خطۂ ارض کے لیے تشریف نہیں لائے بلکہ عالمگیر کتاب ہدایت کو لے کر پورے عالم کے لیے آئے اور آپ کی بعثت مبارکہ کا مقصد عظیم یہی تھا کہ ضلالت وگمراہی کے قعر عمیق میں پڑی ہوئی انسانیت کو رشد و ہدایت کی راہ دکھائی جائے، بھلائیوں اور اچھائیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دی جائے اور برائیوں اور بدیوں سے بچنے کی تلقین کی جائے۔ یہی روشن صداقت مندرجہ بالا ہدایت ربانی میں ناطق نظر آتی ہے۔ خود آپؐ نے ایک موقع پر اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا:

[میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں تا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کر دوں (۱۰)۔]

معروفات اور حسنات (Good Deeds) کی تعلیم اور منکرات وسیئات (Evil Deeds) سے اجتناب کی تلقین ہی اخلاق حسنہ کو بلندیوں تک پہنچا دینے کے مراحل ہیں اور ان مراحل کو طے کرنے میں آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے جس اخلاص وللّٰہیت اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ صداقت بھی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ تیئیس سال کی مختصر مدت میں انسانوں کے دلوں پر خوف خدا کی حکمرانی کا سکہ بٹھا دیا اور انھیں برائیوں اور بدیوں سے متنفر کر کے اچھائیوں اور نیکیوں کا خوگر اور پیامی بنا دیا۔

دونوں جہاں کی سعادتوں کا ضامن

ایمان اور عمل صالح کی روش پر گامزن افراد کو قرآن مجید نے جگہ جگہ بشارتیں دی ہیں۔ اس فانی زندگی کے بعد لافانی زندگی میں نتائج اعمال کا پروانہ ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا (۱۱)۔ دل پسند عیش میں ہوں گے (۱۲) اللہ کے مہمان ہوں گے اور سامان ضیافت سے ان کی پذیرائی ہوگی، عدن کے باغات میں رہنے کے لیے عمدہ ٹھکانے اور صاف وشفاف پانی کی نہریں ان کے لیے ہوں گی۔ تفریح طبع کے لیے انواع واقسام کے سامان ان کے لیے مہیا کیے جائیں گے، ان کے مطالبات اور مانگوں کی بھی قدر افزائی ہوگی اور ان کی چاہتوں اور خواہشوں کا بھی خیال کیا جائے گا (۱۳)۔ اور خوشنودیٔ رب کا پروانہ انتہائی بیش قیمت اور سب سے بڑی چیز ہوگی (۱۴) جو ایمان وعمل صالح سے زندگیوں کو مرصع اور مزین کرنے والوں کے حصے میں آئے گا۔

کتاب اللہ میں ابدی اور لافانی زندگی کی ان نعمتوں کے علاوہ عمل صالح کرنے والوں کے لیے یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شکل میں تقاضائے ایمان کو پورا کرنے والوں کے لیے اس دنیا میں بھی خدا کی تائید ونصرت کا پروانہ ملتا ہے۔ ایمان وعمل صالح کا طریقہ اختیار کرنے والوں کو آخرت کی فوز

عظیم (Great Success) کی بشارت دینے کے بعد فرمایا جاتا ہے:

[اور ایک اور چیز بھی ہے، جس کی تم تمنا رکھتے ہو، یعنی اللہ کی نصرت اور عنقریب ظاہر ہونے والی فتح اور اے نبی! ایمان لانے والوں کو بشارت دے دیجئے (۱۵)۔]

ایک جگہ اچھی زندگی بسر کروانے کی ضمانت دی جاتی ہے، خواہ اس زوال پذیر دنیا (Changeable World) میں ہو یا لافانی اور زوال نا آشنا دنیا (Everlasting World) میں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

[تم میں سے کوئی بھی خواہ مرد ہو یا عورت نیک عمل کرے گا بشرطیکہ ایمان والا ہو، ہم یقیناً اس سے اچھی زندگی گزروائیں گے (۱۶)۔]

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

[بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی اس دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب کہ گواہیاں قائم ہوں گی (۱۷)۔]

اللہ رب العزت کی تائید و نصرت کا سب سے بڑا مظہر اس لافانی زندگی میں یہ ہے کہ اللہ اپنی اس زمین کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھوں میں دے دے جو ایمان کی روش پر گامزن ہوتے ہوئے اس زمین کو تمام قسم کی اچھائیوں کا مسکن بنا دینا چاہتے ہیں اور تمام قسم کی برائیوں کا سد باب کر کے امن و آشتی کی وہ خوشگوار فضا قائم کر دینا چاہتے ہیں جس میں تمام بندگان خدا امن، آشتی اور عدل و انصاف کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دوسروں کے لیے بھی اسی قسم کی زندگی کے خواہاں اور متمنی بن جائیں۔

ایمان لانے والوں کی بابت چاہے وہ دنیا کے کسی خطے کے ہوں یا کسی بھی رنگ و نسل سے ان کا تعلق ہو، اللہ رب العزت ان کے لیے عزت و سرخروئی کا اعلان کرتا ہے۔ فرمایا جاتا ہے:

[حالانکہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے، لیکن یہ منافق نہیں جانتے (۱۸)۔]

فریضۂ منصبی کو ادا کرنے والوں کے لیے خلافت ارضی کا وعدہ:

ایک جگہ بہت ہی واضح الفاظ میں ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے خلافت ارضی دینے کا وعدہ ہوتا ہے، لیکن اس خلافت ارضی کا مقصد نہ تو اپنی انا اور خود ساختہ عزت و وقار کا بھرم قائم رکھنا ہوتا ہے، نہ ہی شہرت و مقبولیت کا حصول اس خلافت ارضی کا مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا کے

دوسرے لوگوں پر مظالم کر کے اپنے جاہ وجلال اور حکومت واقتدار کو قائم کرنا مطمحِ نظر ہوتا ہے، بلکہ اس خلافت ارضی یا زمینی اقتدار کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر میں اللہ کا ہی قانون چلے، صرف اور صرف اسی کی عبادت ہو اور اس کی ذات، صفات اور اختیارات میں دنیا کی کسی بھی ہستی و طاقت کو شریک نہ کیا جائے۔ اس مقصد سے اگر اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں کو زمینی خلافت ملتی ہے تو دنیا میں دنیا کے پیدا کرنے والے کا ہی حکم چلے گا جو رب العالمین، رحمان اور رحیم ہے اور جس کا دیا گیا ضابطۂ زندگی سرتاپا امن وسلامتی ہے، تو پھر دنیا بھی امن وآشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔ اہل ایمان کو زمین میں خلافت ارضی دینے کا وعدہ اور اس کی غرض وغایت کی حکمت اس آیت قرآنی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

[اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو تمکنت وغلبہ عطا فرمائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے(۱۹)۔]

خلافت ارضی کا مفہوم گویا یہ ہوگا کہ اللہ کا دین اس زمین پر غالب ہوکر رہے گا، اسی کا قانون چلے گا، اللہ کی ہی عبادت کی جائے گی، نماز قائم کی جائے گی، غرباء، فقراء اور معاشرے کے دوسرے معذور و مجبور لوگوں پر خرچ کیا جائے گا، اچھائیوں کو فروغ دینے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں گے اور برائیوں سے معاشرے کو پاک کرنے کے لیے کارگر تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے، امتحان گاہ میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، محنتی بھی ہوتے ہیں اور کام چور بھی، ذہین بھی ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی، ہر ایک کو امتحان گاہ میں مخصوص وقت گزارنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور کسی کو صحیح یا غلط جواب دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کا دین دنیا میں قائم ہوجائے، اسی کی حکمرانی ہو تو کسی دوسرے دین کے علمبردار کو مجبور قطعاً نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے دین کے سایہ میں آجائے۔ اللہ رب العزت کا واضح ارشاد ہے:

[دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہوچکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسّی پکڑی(۲۰)۔]

تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ دوسرے ادیان و مذاہب کی عبادت گاہوں کا تقدس برقرار

رکھا گیا اور دین کے قبول کرنے کے سلسلے میں کوئی جبر واکراہ نہیں کیا گیا۔ اگر اس کے برخلاف کوئی مثال ملتی ہے تو اس مخصوص اور متعین شخص کا کردار سمجھا جائے گا نہ کہ اللہ کے دین کا۔ اس لیے کہ اللہ کا دین تو دوسروں کے معبودوں کے بارے میں بھی نازیبا کلمات زبان سے ادا کرنے کی ممانعت کرتا ہے، کجا یہ کہ جبر وتشدد کا طریقہ اختیار کرکے کسی دوسرے دین کے علمبرداروں کو دین اسلام کے حلقے میں شامل کیا جائے۔ ہاں خدا کی زمین تمام بندوں کے لیے امن و آشتی کی جگہ ہو اور تمام کو اپنے دین و مذہب کا پیامی بنے رہنے کی اجازت ہو، اس کے ظلم وعدوان، شر وفساد اور قتل وغارت گری کا بازار گرم نہ ہو اور انسانیت کا تقدس ہر حال میں برقرار رہے، اس کے لیے خدا کے اس دین کے علمبردار مکلّف ہوتے ہیں کہ اچھائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے اور برائیوں کے انسداد کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ یہ کوششیں اور تدبیریں زبان سے بھی ہوں گی، قلم سے بھی ہوں گی، میڈیا کا بھی استعمال ہوگا اور مفاد عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکمت عملی کے ساتھ طاقت کا بھی استعمال ہوگا، لیکن قیام امن کے لیے نہ کہ اپنا زور واستبداد منوانے کے لیے اور نہ ہی اپنی انا کی پیاس بجھانے کے لیے اور نہ ہی حدود مملکت کی توسیع کے لیے۔ اسلامی ریاست کے قیام کا اہم ترین مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام وقوانین جاری وساری ہوں اور دنیا امن و آشتی کے خوشگوار ماحول سے مستفیض ہو۔ فرمان باری تعالیٰ میں اسی مقصد کی کارفرمائی نظر آتی ہے:

[وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اچھائی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں (۲۱)۔]

دین صرف نیکی کرنے اور نیکی کی راہ پر چلنے کی تلقین کا نام نہیں ہے بلکہ برائی سے رُکنے اور برائی سے روکنے کے لیے اقدام وعمل کرنا بھی دین ہے۔ اگر برائی سے نفرت نہیں ہے اور منکرات وفواحش کے خلاف کوئی کارروائی کرنے یا اسے روکنے سے متعلق کسی تدبیر وعمل کے اختیار کرنے کو دین سے الگ کرلیا جائے یا اسے اپنے دائرہ کار سے باہر کا عمل قرار دیا جائے تو یہ دین کا ناقص فہم ہے اور اس فہم وشعور کے ساتھ دین وشریعت پر عمل پیرا ہونا دراصل آدھے دین پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آدھے دین پر عمل کرتے ہوئے اگر دین کے ایک حصہ کو نظر انداز کردیا جائے تو گویا دیندار ہونے کا تصور محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوگا جیسے ایک ایمان والا یہ دعویٰ کرے کہ میں اگرچہ 'لا الٰہ' نہیں کہتا ہوں اور نہ ہی دوسرے معبودان باطل کی بے وقعتی کا خیال تک دل میں آتا ہے، تاہم میں اللہ کو مانتا ہوں۔ کلمہ طیبہ کا اس طور پر قائل ہونا گویا کلمۂ طیبہ کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔

اس قسم کی دین داری میں بلاشبہہ نماز جو دین کا اہم ستون ہے مرکز توجہ بن جاتی ہے، مساجد کے آباد

کرنے کا جذبۂ مستحسن زندہ رہتا ہے اور اس سلسلے میں مبارک کوششیں بھی کی جاتی ہیں، دین کے تمام ارکان کو اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق انجام دینے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ بلاشبہ غرباء، فقراء اور معاشرے کے دوسرے معذوروں اور مجبوروں کے تئیں ہمدردی ومحبت کے اقدامات بھی کیے جاتے ہیں لیکن معاشرے میں رائج برائی کو روکنے کی کوئی مہم نہیں چھیڑی جاتی، ظالم کو ظالم نہیں کہا جاتا، چور اور بدمعاش کے لیے بھی نرم گوشہ باقی رہتا ہے، شر وفساد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا ہے، یہاں تک کہ حق بات کے لیے زبانیں گنگ ہوجاتی ہیں اور مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ کسی کو ناراض نہ کیا جائے اور کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اس صورت حال میں یا دین داری کے اس تصور کے ساتھ معمولات ومشاغل میں کوئی چیز مانع ومزاحم نہیں بنتی، اختلافات واعتراضات کے وار بھی نہیں سہنے پڑتے، کسی فرد اور جماعت کی طرف سے کوئی محاذ آرائی نہیں کی جاتی اور اطمینان کے ساتھ معمول کے تمام کام کیے جاتے ہیں اور باہر کے تمام منصوبوں کو بھی اطمینان کے ساتھ جامۂ عمل پہنایا جاتا ہے، لیکن اللہ کی کتاب اس حقیقت کو کھول کر بیان کرتی ہے کہ دوسروں کی نگاہ میں قابل اعتراض نہ ہونے کا جذبہ اور متقی وصالح اور فاسق وفاجر، نیکی اور اچھائی کے علمبردار اور بدی وبے حیائی کے نقیب سب کو خوش کرنے کی پالیسی (۲۲) ایمان کی بیش بہا نعمت سے فیض اٹھانے والوں کے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ یہ جذبہ وعمل یا طریقہ وتدبیر ایک منافق تو اختیار کرسکتا ہے لیکن ایک مومن حق گو ہوتا ہے، غلط اور صحیح دونوں اس کے نزدیک برابر نہیں ہوتے۔ وہ اس بات سے بے خوف ہوتا ہے کہ سچائی کے اظہار اور حق کے اعتراف میں اعداء واجانب اس کے مقابلے میں آجائیں گے۔ تمام لوگوں کو خوش کرنے کی تدبیر یا اس سلسلے میں کوئی بھی اقدام وعمل دراصل منافقت ہے۔ جسے قرآن مجید فساد فی الارض سے تعبیر کرتا ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ ہو:

[اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی دوہری پالیسی کے ذریعہ) زمین میں فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کا کام کرنے والے ہیں (۲۳)۔]

گویا قرآن مجید کے مطابق ایک منافق کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر دلعزیز بننا چاہتا ہے جس کے لیے اخلاص پر مبنی ایمان بالکل گنجائش نہیں چھوڑتا، کیونکہ یہ طریقہ قرآن کے مطابق فساد فی الارض کے ارتکاب کے مترادف ہے۔ منافق کی ایک خصلت کتاب اللہ میں یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ مفاد کا غلام ہوتا ہے اور کبھی بھی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ دین ومذہب کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے باعث ایمان والوں پر جو مصائب آتے ہیں مرض نفاق میں مبتلا لوگ ان کا استہزا کرتے ہیں اور ایسے مخلصین کو احمقوں میں شمار کرتے ہیں (۲۴)۔ فتح وکامرانی کی شکل میں نتیجۂ خیر کو دیکھ لینے کے بعد تو وہ آگے آگے

ہوتے ہیں لیکن ایمان کی راہ میں مصائب کی گھنگور گھٹاؤں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک جاتے ہیں اور ناخوشگوار احوال وکوائف سے ایمان والوں کا جب کبھی سابقہ پڑتا ہے تو وہ طنز وتمسخر کے انداز میں یہ کہتے ہیں کہ ہم نے عقل ودانائی کو استعمال کرتے ہوئے ان مصائب وشدائد سے بچنے کی پہلے ہی تدبیر کر لی تھی (۲۵)۔ گویا ان کو اپنے فہم وفراست اور عقل وفرزانگی پر ناز ہوتا ہے اور ابتلاء وآزمائش سے دوچار ہونے والے مسلمانوں کو ہدف استہزاء بناتے ہیں۔

برائی کے خلاف محاذ آرائی ابتلاء وآزمائش کا پیش خیمہ

ایمان تو نام ہی ہے مصائب وشدائد کو دعوت دینے کا، بشرطیکہ ایمان اخلاص پر مبنی ہو۔ صرف اور صرف اللہ رب العزت کو خوش کرنا ہدف ومقصود بن جائے اور تمام مفادات بالائے طاق رکھ دیے جائیں جبھی ایمان مکمل ہوتا ہے اور مومن شایان شان مقام ومرتبہ کا حامل قرار پاتا ہے اس وصف سے مزین ہونے کے بعد ہی اعتراضات واختلافات کی خلیجیں بھی حائل کی جاتی ہیں، اپنوں اور غیروں کی طرف سے بسا اوقات نشانہ ستم بھی بننا پڑتا ہے، جان، مال اور کھیتیوں کی بربادی کا غم بھی جھیلنا پڑتا ہے اور یہ سب تقاضائے ایمان ہیں۔ احکم الحاکمین کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

> [اور ہم تمھیں خوف سے اور بھوک سے اور مالوں، جانوں اور میووں کے نقصانوں سے ضرور آزمائیں گے۔ اور اے نبی ﷺ! ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں اور وہی سیدھی راہ پر ہیں (۲۶)۔]

ایمان اور آزمائش تو لازم وملزوم (Necessity and Necessitated) ہیں۔ بالفاظ دیگر جو جتنا بڑھ کر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اسی قدر وہ ابتلاء وآزمائش کے مراحل سے گزرتا ہے۔ پیغمبر وقت حضرت نوحؑ نے قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی لیکن ان کے سامنے یہ روح فرسا منظر بھی آیا کہ شبانہ روز جدوجہد، آہ وفغاں اور گریہ وزاری کے باوجود ان کی بیوی تک ایمان نہیں لائی اور ان کا بیٹا بھی اس شرف سے محروم رہا۔ ایمان کی راہ میں ماں باپ، اعزہ واقربا اور حکومت وقت کی طرف سے جس مرحلہ جانکاہ سے گزرنا پڑا قرآن میں اس کی سرگزشت موجود ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو قوم نے آرے سے چیر دیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر یہودی بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قوم نے کیسی کیسی خباثتیں نہیں کیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قوم نے سولی پر لٹکانے کی ناپاک سازشیں تک کرلیں۔ ایمان کے عظیم جانبازوں اور دین حق کے ان سرفروشوں کے علاوہ رحمۃ للعالمین اور خاتم الانبیاء کی حیات طیبہ کا کوئی ورق بھی ابتلاء و آزمائش کے جاں گسل مراحل سے خالی نہیں ہے۔

بلاشبہ سرورکونینﷺ جب معروف اور مروج طریقے سے اللہ واحد کی یاد دل میں بسائے ہوئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر چکے تھے، لات، عزیٰ، ہبل اور منات اور دوسرے معبودان باطل پر کلام کیے بغیر اور معاشرے میں پھیلے ہوئے منکرات وفواحش کے انسداد کی عملی جدوجہد سے دور رکھتے ہوئے جب غار حرا کی زندگی میں معروف اور مروجہ طریقۂ عبادت میں مصروف تھے تو اس وقت تک امین، صادق اور دیانت دار کی حیثیت سے تمام لوگوں میں مقبول تھے، لیکن جب وحی الٰہی کی کرنوں سے آپ کا قلب منور و مصفّٰی ہوا اور صفا کی بلندی پر چڑھ کر جب معززین قریش کے آباء واجداد کے طریقۂ عبادت و پرستش پر تنقید کی اور تمام معبودان باطل سے رشتہ منقطع کر کے اللہ رب العالمین کی عبادت کی دعوت دی تو تاریخ شاہد ہے کہ خاندان کے اپنے لوگ بھی دشمن بن گئے اور دوسرے لوگوں نے بھی آپﷺ کی مخالفت پر کمر کس لی۔ ابولہب بھی پیدا ہو گیا، ابوجہل بھی سامنے آیا، عتبہ اور ولید نے بھی بغض وعناد اور عداوت ومنافرت کا محاذ سنبھال لیا۔ دین حق کی اس راہ پرخار میں بار بار آپؐ کے قتل کے منصوبے بنائے گئے، داعی اور دعوت کی عظمت کو مجروح کرنے کے لیے اوچھی تدبیریں کی گئیں، مذموم و ناپاک سازشیں رچی گئیں، آپؐ کے صحابہ کو گرم گرم ریتوں پر لٹایا گیا، سینوں پر پتھر رکھ دیے گئے۔ آپﷺ شعب ابی طالب میں اپنے جانثار صحابہؓ کے ساتھ قیدی بنائے گئے، طائف کے مرحلۂ جانکاہ سے گزرنا پڑا، وطن عزیز تک کو چھوڑنا پڑا اور جنگیں تک لڑنی پڑیں۔ اس کے بعد ہی فوج درفوج دین میں داخلے کا روح پرور منظر سامنے آیا جبھی آپؐ اور آپؐ کے احباب ورفقاء کے لیے 'رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ' (۲۷) کا اعلانیہ جاری ہوا۔

منکرات سے محاذ آرائی مراتب ایمان کی علامت اور جنت کی ضمانت

دین کا کام کرتے ہوئے امر بالمعروف کے ساتھ ساتھ نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ جتنے جوش اور جذبہ کے ساتھ اچھائیوں کا حکم کرنے کا فریضہ ادا کیا جاتا ہے اتنے ہی جوش و جذبہ کے ساتھ بلکہ اس سے بڑھ کر برائیوں کے خلاف علم اٹھانا ہوگا۔ ہاں اس پرخطر مرحلے میں ہوش جوش پر

غالب رہے اور حکمت عملی کا دامن ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ برائی کو روکنے کے لیے تین طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ لازماً اختیار کرنا پڑے گا ورنہ ایمان کا دعویٰ محض دھوکہ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان مقدس اس سلسلے میں قابل ملاحظہ ہے:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذٰلک اضعف الایمان۔(۲۸)

[تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو وہ اسے ہاتھ (طاقت) سے روک دے، پس اگر ہاتھ (یا طاقت) سے روکنے کی استطاعت نہ رکھے تو اسے زبان سے روک دے، پس اگر زبان سے بھی روکنے کی استطاعت نہ رکھے تو اسے دل سے روک دے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔]

مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایمان کا پہلا درجہ یہ ہے کہ برائی کو طاقت کے زور سے ختم کیا جائے۔ لیکن اگر طاقت نہ ہو یا برائی کو طاقت کے زور سے ختم کرنے کی بنا پر نسبتاً بڑی برائی کے واقع ہونے کا خدشہ ہو تو حکمت و مصلحت یہی ہے کہ زبان سے اس برائی کو روکا جائے۔ زبان سے بھی برائی کو روکنے پر اس سے بڑی برائی کے سامنے آنے کا خطرہ ہو تو حکمت و دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دل سے اس برائی کو روکا جائے اور دل سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ اس برائی سے متعلق اور اس کے کرنے والے سے متعلق دل میں کوئی نرم گوشہ نہ ہو۔ برائی کو دیکھ کر اس قدر اضطراب و بے چینی ہو کہ معمولات و مصروفیات میں بھی فرق آ گیا ہو۔ یعنی برائی کو دل پر لے لیا جائے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز اگر دل پر لے لی جائے تو چہرے پر بھی اس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور حرکات و سکنات بھی اس کی غمازی کرتے ہیں۔ گویا برائی کو دل پر لے لینے کے بعد ایک شخص سکون و اطمینان کی کیفیت سے سرشار نہیں ہوتا بلکہ اس پر سیمابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ موقع ہاتھ آ جائے کہ برائی کو زبان کے ذریعہ ختم کر دیا جائے یا طاقت کے استعمال سے اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔

معروفات اور حسنات سے والہانہ محبت دین داری کا ایک رخ ہے، اس کا دوسرا رخ ہے فحشاء اور منکرات سے نفرت وعداوت۔ بلکہ اچھائیوں کے معتبر اور قابل قدر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ برائیوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے اور ان سے اس حد تک نفرت ہو جائے کہ ان کے انسداد سے متعلق عملی اقدامات کو فال نیک سے تعبیر کیا جائے اور اس سلسلے میں سرگرمیٔ عمل کا ثبوت دیا جائے۔ اپنوں اور غیروں کی طرف سے مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا، ابتلاء و آزمائش کی مختلف شکلیں سامنے آئیں

گی، مصائب ومشکلات کی وادیاں بھی سر کرنا ہوں گی جبھی جنت کا امیدوار بھی بنا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ربانی ارشاد بانگ درا کا کام کرتا ہے:

[کیا تم لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم لوگوں کو جنت کا داخلہ مل جائے گا حالانکہ تم لوگوں کو اب تک ان حالات سے سابق نہیں پڑا ہے جن حالات سے تم سے پہلے کے لوگوں کو سابقہ پڑا(۲۹)۔]

فحشاء اور منکرات سے روکنا امت مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہر فرد پر دراصل منصبی ذمہ داری کا تقاضا تو ہے ہی اور اس کی انجام دہی کی بدولت ہمیشہ ہمیش کی دنیا میں خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نعمتوں اور آسائشوں سے یہ شخص نہال ہوگا۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں بھی برائیوں سے پاک معاشرہ ایسے داعیِ حق کو میسر ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی زندگی بھی خوشگوار ہوتی ہے، اس کے متعلقین کی بھی اور ان تمام افراد کی زندگیوں میں حسن و رعنائی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک صالح معاشرہ چاہتے ہیں لیکن کسی وجہ سے یہ نعمت انھیں میسر نہیں ہو پاتی۔ گویا یہ ذمہ داری دنیوی فائدے کے پیش نظر بھی اہم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ ذمہ داری انجام نہیں دی جاتی تو اس برائی کے تعفن سے اس کا گھر بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نفاست پسند ہے، اس کا گھر تو صاف ستھرا ہے لیکن پڑوس میں کوئی ایسا کتا پڑا ہوا ہو جو مر کر سڑ گیا ہو تو اس کی بدبو سے وہ اور اس کا گھر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح کوئی اخلاقی بے حیائی اس کے گھر میں اگرچہ نہ ہو لیکن اگر معاشرے میں کہیں اس طرح کی بے حیائیاں عام ہوں تو اس کے اثرات دیر سویر اس کے گھر میں بھی پہنچیں گے۔

سطور بالا سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ظاہری اور معنوی طور پر گھر کی دنیا کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے اور گھر والوں کو خوشگوار زندگی گذارنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ماحول اور معاشرے کی فکر کی جائے، ان کو اچھائیوں کا حکم دینے اور ان کی طرف راغب کرنے کے ساتھ ساتھ برائیوں سے نفرت دلائی جائے بلکہ برائیوں کے خلاف بھی اسی جذبہ و قوت کا مظاہرہ کیا جائے جس کا مظاہرہ ایک داعیِ حق کی حیثیت سے خیر کی طرف دعوت دینے میں کیا جاتا ہے۔ اسی طریقہ عمل میں دنیا کی اس چندروزہ زندگی میں سب کے لیے بھلائی کا راز مضمر ہے بصورت دیگر برائی کرنے والے تو دانستہ یا نادانستہ اپنے آپ کو تباہ و برباد تو کرتے ہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ برائی کے خاموش تماشائی بھی محفوظ نہیں رہتے۔ برائی کو نظر انداز کرنے یا اس کے سلسلے میں نرم پالیسی اختیار کرنے کی سنگینی کو رسول مقبول ﷺ نے تمثیلی انداز میں اس طرح واضح کیا:

[حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدوں پر قائم ہے اور جو ان حدوں میں سستی کرتا ہے یعنی جو احکام الٰہی کی بجا آوری کرتے ہیں اور جو ان کی ادائیگی میں غفلت و سستی کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے سمندر کی ایک کشتی کے حصے بذریعہ قرعہ اندازی وغیرہ تقسیم کیے، کچھ اوپر کے حصے میں رہنے لگے اور کچھ نیچے کے حصہ میں۔ سمندر میں جو لوگ کشتی کے نچلے حصہ میں رہے وہ اوپر چڑھ کر پانی لانے لگے، پانی لانے میں اوپر کے لوگوں پر پانی گرنے لگا۔ چنانچہ اوپر والوں نے کہا کہ تمہارے چڑھنے سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے، ہم تمھیں چڑھنے نہیں دیں گے اس کے جواب میں نیچے والوں نے کہا، اچھا تو ہم نچلے حصے میں سوراخ کر کے پانی لے لیتے ہیں اب اگر ان لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا ہوتا اور سوراخ کرنے سے باز رکھا ہوتا تو سبھی (اوپر والے اور نیچے والے) بچ گئے ہوتے اور اگر ان کو یوں ہی چھوڑ دیتے تو سبھی ڈوب جاتے (۳۰)۔]

قرآن مجید میں تباہ شدہ قوموں کے واقعات و احوال سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک مشترک بیماری یہ لاحق تھی کہ معاشرتی برائیوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا، اس سلسلے میں ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور مخصوص قسم کی دینداری ان کا شیوۂ حیات بنی رہی۔ ایک عالم دین کے اس تبصرے میں صداقت ہے:

''پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں، ان سب کو جس چیز نے گرایا، وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی خمیر اس طرح بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رُک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں (۳۰)۔''

اللہ رب العزت کی طرف سے جہاں تمام مادّی نعمتیں فراہم کی گئیں اسی طرح دنیا کی پیدائش کے آغاز سے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا کہ انسانوں کو اس طریقۂ زندگی سے روشناس کرایا جائے جو دنیا کے اس امتحان گاہ میں ایک کامیاب امتحان دہندہ بنا دے جس کے نتیجے میں اس امتحان گاہ میں بھی اس کی زندگی امن و عافیت کے ساتھ گزر جائے اور موت کے بعد کی ابدی زندگی جو نتیجہ گاہ کی حیثیت رکھتی

ہے، اس میں بھی وہ سرخرو و کامیاب ہو جائے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر نبی آخر الزماں محمد عربی ﷺ تک اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیاں ایک ہی دین کے ساتھ مبعوث کی گئیں، ہاں آخری نبی محمد عربی ﷺ کا امتیاز اس میں مضمر ہے کہ آپ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے تشریف لائے اور چونکہ قیامت تک کوئی نبی اب نہیں آئے گا، اس لیے آپ کے ذریعہ لایا گیا دین پوری انسانی برادری کے لیے مکمل ضابطۂ زندگی اور عظیم ترین نعمت کی شکل میں تمام معاملات زندگی میں کافی وشافی ثابت ہوگا۔

اللہ کا یہ دین امانت ہے جو کلمہ طیبہ کے پاک بولوں کو اپنانے والے تمام بندگان خدا کے کاندھوں پر ہے۔ اگر یہ امانت دنیا کے ان لوگوں تک نہیں پہنچائی گئی جو اس دین سے ناواقف ہیں تو ایک بڑی خیانت کا ارتکاب ہوگا۔ دوسری طرف دین یا مذہب انسانوں کا بڑا حق ہے اگر یہ حق ان تک نہیں پہنچایا گیا اور اس سے ان کو روشناس نہیں کرایا گیا تو گویا یہ انسانوں کے ایک بڑے حق کو سلب کر لینے یا اس کو تلف کرنے کے مترادف ہوگا، جس کا خمیازہ قیامت کے روز یقینی طور پر بھگتنا پڑے گا۔ ادائیگی امانت یا حق العباد کے علاوہ اللہ کے بندوں تک اس دین کو پہنچانے کا ایک اہم محرک منصبی ذمہ داری بھی ہے، کیونکہ کلمۂ طیبہ کو دل سے مان لینے اور زبان سے اقرار کرنے والے حضرات دنیا کے تمام افراد اور تمام گروہوں میں خیر امت (Best Group of Mankind) کے لقب سے نوازے جاتے ہیں، لیکن یہ لقب مشروط ہے اس مقدس عمل سے کہ وہ انسانیت کی نفع رسانی کے لیے کام کریں۔

نفع رسانی کا یہ مقدس عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) سے عبارت ہے۔ گویا امانت کی ادائیگی کا جذبہ ہو یا حق العباد کے پورا کرنے کا حوصلہ یا پھر منصب و مقام کے مشروط (Couditional) ہونے کی بات اور اس کے شایان شان فریضہ انجام دینے کی تڑپ و جستجو، ان سب کے پیش نظر دین کا اہم اور درخشاں پہلو یہ ہے کہ اچھائی کی جائے اور اچھائیوں کا حکم دیا جائے، دوسری طرف یہ پہلو بھی اتنا ہی مہتم بالشان اور تابناک ہے کہ برائی سے رُکا جائے اور برائی کے انسداد کی جدوجہد کی جائے۔ اگر چہ اچھائی کرنا اور اچھائیوں کا حکم دینا وہ عمل خیر ہے جس کو ہدف بنا کر دین کا کام کرنے میں مخالفتیں نہیں ہوتیں، ابتلاء و آزمائش کے سنگین مراحل نہیں آتے اور ظالموں، جابروں اور معاشرے کے دوسرے فاسد عناصر کی طرف سے محاذ آرائی نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن وسنت کی تعلیمات اس سلسلے میں واضح ہیں کہ مخالفتیں تو اس راہ کا توشہ ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ جس نے جتنا بڑھ کر کلمۂ طیبہ کا علم اٹھایا اسے اتنی ہی زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ مرحلۂ سنگین اس وقت آتا ہے جب امر بالمعروف کے ساتھ ساتھ نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا جائے۔ ایک

باغی کو باغی کہا جائے، ایک طاغی کو طاغی کہا جائے، ایک ظالم کو ظالم کہا جائے اور ایک بدکار کو بدکار کہا جائے اور اس کی حرکتوں سے روکنے کی کوشش کی جائے ہاں حکمت عملی (Practical Wisdom) اور موعظۂ حسنہ (Good Saying) کی ہدایت کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ہوگا۔ امر بالمعروف کے ساتھ ساتھ نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے ذریعہ ہلاکتوں سے اپنے آپ کو بھی بچایا جاسکتا ہے اور دوسروں کو بھی اور جو مصیبتیں بھی آئیں گی وہ کامیابی کا نوید بن جائیں گی۔

حواشی و مراجع

(۱) البقرہ:۲۱۳ (۲) الشوریٰ:۱۳،۱۴

(۳) المائدہ:۳ (۴) آل عمران:۱۱۰

(۵) البقرہ:۱۴۳ (۶) الحج:۷۸

(۷) ملاحظہ فرمائیں، البقرہ:۱۱-۱۴، التوبۃ:۶۷،۷۱

(۸) آل عمران:۱۱۰ (۹) الاعراف:۱۵۷

(۱۰) رواہ البخاری فی الادب المفرد (۱۱) الحاقۃ:۱۹، البلد:۱۸

(۱۲) القارعۃ:۷ (۱۳) حٰمٓ السجدۃ:۳۱

(۱۴) التوبۃ:۷۲ (۱۵) الصّف:۱۳

(۱۶) النحل:۹۷ (۱۷) غافر:۵۱

(۱۸) المنٰفقون:۸ (۱۹) النور:۵۵

(۲۰) البقرہ:۲۵۶ (۲۱) الحج:۴۱

(۲۲) البقرہ:۱۴ (۲۳) البقرہ:۱۱

(۲۴) البقرہ:۱۳ (۲۵) التوبۃ:۵۰

(۲۶) البقرہ:۱۵۵ (۲۷) البینۃ:۸

(۲۸) احمد بن حنبل: المسند، ج۳،ص۱۰ (۲۹) البقرہ:۲۱۴

(۳۰) جامع الترمذی، ج۲، ابواب الفتن، ص۴۰، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی

(۳۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، ج۲، ص۳۷۲، فروری ۲۰۰۴ء، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

ترانۂ فلاح: تلاش و تعبیر (۲)

ڈاکٹر امتیاز وحید، شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، یونیورسٹی آف دہلی
Mobile0**8287457355**/email:ijnuwaheed@gmail.com

جامعۃ الفلاح کے لیے کئی ترانے لکھے گئے۔ البتہ سعادت اور خوش بختی کا سہرا متذکرہ موجودہ ترانے کے سر بندھا۔ اس کے علاوہ فلاح کے لیے ایک طویل ترانہ مولانا عبدالشکور دوؔر صدیقی نے بھی لکھا، جو "ہزج مقبوض مقصور" بروزن مفاعلن مفاعلن مفاعلن فعل کی بحر میں ہے۔ ترانہ حاضر خدمت ہے ؎

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
رگوں میں خونِ حرّیت لیے جواں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم
پیامِ زندگی لبوں پہ ہے وہ کارواں ہیں ہم

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

صراطِ مستقیم پر ہمیشہ ہم ہیں گامزن
زباں پہ حمد و نعت، دل میں ذکرِ ربّ ذوالمنن
نظر میں علمِ دینِ حق، عمل میں اسوۂ حسن
حیاتِ نو ہے فکر کے لیے امید کی کرن

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

قلم ہمارے ہاتھ میں،علَم ہمارے ساتھ میں!
پیامِ دینِ حق ہمیں سے پھیلا شش جہات میں
دلیلِ راہ حق ہمیں ہیں بزمِ کائنات میں
حیات بخش درس مل گیا رہِ نجات میں

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

کتاب و سنت و فقہ ہے زندگی کا آئینہ
سَلف کی شاہراہ ہے قدم کا اپنے رہنما
قدیم کیا جدید دونوں کے ہمیں ہیں پیشوا
چمن کا ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے جس کو مرحبا!

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

ہیں رزمگاہِ خیر وشر میں جان سربکف لیے
ہماری بزم گاہ نور چہرۂ شرف لیے
چراغِ مصطفیٰ کا نور پہونچے ہر طرف لیے
بکھیرتے ہیں کوچہ وگلی میں صف بہ صف لیے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

ہمارے علم وفن کی شان کا ہے یہ عمل دخل
دلوں میں جذبۂ جنوں بدن میں گرمیِ عمل
یہ علم وفن کی کاوشیں ہیں دل شکن نہ جاں گسل
ہوئے نہ سدِّ راہ بھی کبھی مسالکِ و مِلل

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

فلاح کی ہے سرزمیں بہارِ جاوداں لیے!
ہے نغمگیِ نغمہ زن، سرود و قلبِ جاں لیے
شگفتگیِ برگِ گل ہے نکہتِ جناں لیے
ہیں شیخ و شاب جامعہ متاعِ دو جہاں لیے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

ہر ایک مخلص و مجاہد اپنا خضرِ راہ ہے
دلاورِ زعیمِ وقت، مردِ دیں پناہ ہے
شعارِ دینِ حق ہمارے حق میں زادِ راہ ہے
سبوئے دورِ جامعہ میں کیف لا الہ ہے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

رواں دواں اگر ہیں ہم تو منزل آشنا قدم
عمل سے درسِ اتحاد دے رہے ہیں دم بدم
ہماری سمت اٹھتی ہے نگاہِ شوکت و حشم
مشن ہمارا ہاں مشن ہمارا، قسمتِ اُمَم

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

ترقیوں کا یہ جہاں ہمارے دم قدم سے ہے
ضیائے آفتاب علمِ دیں ہمارے دم سے ہے
یہ جذبِ ذکر و فکر و اعتقادِ حق تو ہم سے ہے
نصوصِ دینِ مصطفیٰ، نظامِ محترم سے ہے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

صریرِ خامۂ ادب، نوازنِ حجاز ہے
شعاعِ مہر و عز و جاہ خود چمن طراز ہے
جو گل ہے بوئے علم وفن سے آج سرفراز ہے
عنادلِ ہزار کا درِ دبستاں باز ہے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

جو لالہ و گل و سمن چمن میں خوش ادا ہوئے
تو طائرانِ نغمہ زن ہمارے ہمنوا ہوئے
صبا نسیم عطربیز پیرہن فضا ہوئے
سرود نغمہ، زمزمہ نوائے جانفزا ہوئے

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

عزائم اپنے دوستوں کے انقلاب آفریں
جہانِ رنگ و نور میں تو ہیں ہمارے خوشہ چیں
ہوا سواد اعظم اک ہمیں سے صاحبِ یقیں
ہے جامعہ کا فرد فرد، آج مرد آہنیں!

یہ گلشنِ فلاح ہے اور اس کے باغباں ہیں ہم
بہارِ دین و دانش و یقیں کے پاسباں ہیں ہم

مرحوم دورؔ صدیقی کا ترانہ اس وقت سامنے آیا جب فلاح کے موجودہ ترانے پر قبولیت کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔ لہٰذا دورؔ صدیقی کی یہ تخلیق پردۂ اخفاء میں چلی گئی اور کہیں دیکھی نہیں گئی۔ بعض انجانے اسباب حیاتِ نو میں اس کی اشاعت کی راہ میں حائل رہے۔ اس دوران وہ خود راہیِ ملک عدم ہوئے اور اسے شائع شدہ صورت میں دیکھنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے۔ بھلا ہو اس ساعت کا جب میرے مربی

استاذ مولانا اسماعیل فلاحی صاحب نے مجھے اس کی اطلاع دی اور میں اس کے حصول میں کامیاب رہا۔ مرحوم کے لائق فرزند جناب جبرئیل امین فلاحی نے اپنے والد کی اس امانت کو سینے سے چمٹائے رکھا تھا۔ موصوف کے خط میں رقم ترانے کی اسکین کاپی بذریعہ ای میل ملی تو اس کے بین السطور درد کی واضح لکیریں بھی موجود تھیں۔ وہ لوگ جو فلاح کو اس درجہ ٹوٹ کر چاہتے ہیں، ان کے تئیں ہمیں اپنا رویہ سوالیہ نشان کے دائرے میں نظر آیا۔

دوّر صدیقی کا شمار مشرقی یوپی کے معتبر علماء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے گورکھپور میں جماعت کے ناظم جناب مولانا شبیر احمد صدیقی کے ساتھ معاون ناظم کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۸/۱۹۸۹ کے درمیان فلاح آنا جانا رہا۔ فلاح اور اس کے نظام کے مداح تھے، اپنی شاعری کو فکر اسلامی کے تابع رکھا۔ شاعری میں معروف استاد نوح ناروی کے شاگرد تھے۔ مرحوم جناب جبرئیل امین فلاحی کے والد ہیں۔

جناب دوّر صدیقی کا ترانۂ فلاح ان کی تعمیر پسند طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ یہ ترانہ اسلامی نظام اور فکرِ اسلامی کے تئیں ذمے دارانہ احساس پر مبنی ہے۔ رواں بحر کے حصار میں جو قافیے بوئے گئے ہیں ان میں حوصلہ بردار جذبات کی تازہ کار کونپلیں نوخیز کلیوں کے مانند چٹکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اردو شاعری میں روایت کی دھول اتنی اڑتی ہے کہ بسا اوقات کسی فن پارے کے بارے میں دو چار توصیفی جملے بھی کہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ نے تعریف کی اور کسی نے یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ صاحب اس کی روایت تو پہلے سے موجود ہے، بھلا اس میں کیا نئی بات ہے۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دوّر صدیقی کے ترانے میں حیات بخش درس کی بہتات ہے۔ خیر وشر کی رزم گاہ میں حوصلوں کو صیقل کرنے کا ہنر ہے، مسالک و مِلَل کے بکھیڑوں سے بے نیاز نظامِ فلاح میں مضمر اس کے آفاقی پیغام کی خوشبو ہے۔ چراغِ مصطفوی سے عالم کو منور کرنے کا بانکپن ہے۔ کتاب وسنت پر مبنی شریعت کی کھنک ہے۔ اسلاف کے قدموں کے نشان ہیں اور اخلاف کے لیے راہِ نجات کا نسخہ بھی۔

مرحوم دوّر صدیقی نے ترانے کے لیے تعمیر پسند فضا خلق کی ہے۔ رجائیت دوّر کے ترانے کا منشور ہے۔ ٹیپ کے مصرعوں کی قرأت سے ذہن میں آرمی کی دھن کا تشجیعی ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ تخلیق میں فنکار کی آنکھیں محض موضوع اور مطالب پر ہی ٹکی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اس کا وجدان بھی ایکٹیو ہے، جس سے سرشاری اور وارفتگی کی نہریں نکلتی ہیں۔

زائد از پانچ دہائی قبل جامعۃ الفلاح کی ابتدائی تاریخ میں جائیں جب اس کے پال پر یکجا ہو رہے

تھےاور چند مخیرؒ حضرات کے ہاتھوں میں یہ بس دینیات کا ایک مکتب تھا، اس وقت فلاح کا ایک تشجیعی ترانہ معرضِ وجود میں آیا۔ یہ ترانہ مکتب کے قافلے میں شامل ایک ایسے استاد کا نتیجۂ فکر تھا جو فلاح کی تعمیر وترقی میں خود کو جنون کی حد تک کھپا چکا تھا اور بالآخر اسی خاک کا حصہ ہوکر حیاتِ جاوداں پائی۔ یہ ہیں مرحوم مولانا شبیر احمد انور اصلاحیؒ کی ذات گرامی۔ اب بلا تاخیر پہلے ترانہ ملاحظہ ہو پھر چند باتیں۔

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

ہیں ولی اللہؒ کے اسرار سربستہ یہاں — منزل قاسم و مودودی کا ہم رشتہ یہاں
فکر شبلیؒ و فراہیؒ کا ہے گلدستہ یہاں — آئینہ افکارِ ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

سرزمین ہند کی قسمت جگی — بجھ گئی ہے اس کی ساری تشنگی
اس کی ساری چھٹ گئی ہے تیرگی — نورِ حق شمعِ ہدایت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

گونج کر اس کے مؤذن کی صدا — ہے فضا میں بن گئی بانگ درا
جادہ پیما ہوگیا ہے قافلہ — ہاں اسی میں بہر ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

آگہی ہے اب دلوں کی آرزو — اس کے ہر بچے میں ہے الفت کی خو
علم و حکمت ہی ہے سب کی جستجو — اہلِ دانش کی یہ جنت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

بچیاں زہرہ بنیں بچے حسین — کیونکہ ان کی تربیت ہے فرضِ عین
اب ملے گا ملت خستہ کو چین — تربیت گاہِ نبوت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

بن گئے طلبہ ادھر عالی صفات — بہرہ ور ہیں علم و فن سے طالبات
پا گیا ہے ہر کوئی راہِ نجات — اہلِ صفہ کی امانت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

مادرِ علمی ہے تُو، ہم نونہال — ہے تری شانِ جلالی میں جمال
علم و فن میں ہم نے جو پایا کمال — سب ترا مرہونِ منت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

خیرِ امت کی یہی تفسیر ہے — اور اقیموا الدین کی تعبیر ہے
قصرِ ملت کی نئی تعمیر ہے — مقصدِ ابرارِ ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان وحکمت ہے فلاح

ہر طرح عصمت بچائیں گے تری — شان سے شوکت بڑھائیں گے تیری
ہم نہیں صورت بھلائیں گے تری — انوّر آبِ روئے ملت ہے فلاح

مولانا مرحومؒ کے ترانے میں فلاح کے نصب العین، اہداف اور منشور کی قدرے نکھری صورت موجود ہے۔فلاح کا امتیاز صرف یہ نہیں کہ یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے بلکہ تعلیم کے ساتھ تربیت اس کے دستورالعمل کا ایک دوسرا متوازی پہلو ہے۔''تربیت گاہِ نبوت'' سے مولانا کا اشارہ غالباً فلاح کے اسی امتیازی وصف کی جانب ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس ادارے کے خدوخال پہلے سے طے شدہ تھے یعنی' فکرِ فراہی پر مبنی قرآنی تعلیم کی مرکزیت' ساتھ ہی فکرِ مودودی سے اخذ واستفادے کے نتیجے میں تحریکیت۔''بچیاں زہرہ بنیں بچے حسینؓ'' کے شعری اظہار میں یہ بھی واضح تھا کہ اس میں طلبہ اور طالبات دونوں کی تعلیم وتربیت کا نظم ہوگا۔اسلامی فکر کے ساتھ تعلیمی میدان میں ان خطوط پر تعلیم وتربیت مولانا کے نزدیک ''اقیموا الدین کی تعبیر'' رہی ہوگی جس کا اظہار عملی طور پر وہ فلاح کی صورت میں کر رہے تھے۔مولانا کے الفاظ میں یہ

''قصرِ ملت کی نئی تعمیر ہے''۔ ۱۹۸۶ء میں جب میں نے فلاح کو پہلی بار دیکھا تو اس شعری استعارے کا بھید مجھ پر نہیں کھل سکا لیکن مولانا سے مل کر اور ان کی حالتِ زار کو دیکھ کر بہت جلد یقین آ گیا کہ ملت کے کسی نئے قصر کی تعمیر کا مرحلہ کس قدر جان لیوا ہوتا ہے۔ مسخ شدہ جسم و جاں لیے مولانا مرحومؒ کی ذات اس استعارے کے بھید کا خلاصہ تھی۔ مولانا کا یہ ترانہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ان کے فکر و عمل کا حاصل ہے۔

ثانوی درجات پر مشتمل فلاح کے شعبۂ نسواں کے لیے بھی مولانا مرحوم شبیر احمد انور اصلاحی صاحب نے 'بناتِ مدرسہ' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ یہ قوم کی بچیوں کے لیے ان کی فکر مندی اور دلی جذبات کو سامنے لاتی ہے۔

میری قانتہ، محسنہ نیک سیرت
یہ سیما، سویدہ، یہ رعنا، مسرت

تمھیں سے ہے رونق صحن چمن میں — کہ جیسے چمکتے ہوں تارے گگن میں
بنات مدرسہ، جہالت کی دشمن — ہو روحِ بہاراں تمھیں جانِ گلشن
حیات اور غیرت کی تصویر ہو تم — کہ انور کے خوابوں کی تعبیر ہو تم
کرو عام تم اسم ایمان وعصمت — لیے جاؤ بیٹی یہ میری نصیحت
تمھیں حسنِ اخلاق فرحت عطا ہو — تمھیں نیک عذرا کی عصمت عطا ہو
رضیہ سے حسنِ رضا لے کے جاؤ — زبیدہ کے دل کی دعا لے کے جاؤ
گل طیبہ کی عطر بیز نکہت — تمھیں بھی عطا ہو یہ فیضانِ رحمت

حسیب مکرم نے دی ہیں دعائیں
ستاروں کی مانند سب جگمگائیں

نظم کے سارے کردار زیر تعلیم طالبات قانتہ، محسنہ، سیما، سویدہ، رعنا اور مسرت اور استانی کی حیثیت سے ان کی تعلیم و تربیت پر مامور فرحت، عذرا، رضیہ، طیبہ اور زبیدہ انوری پر مبنی ہیں۔ انور یعنی مولانا شبیر احمد اصلاحی اور حسیب مکرم، اس وقت جامعہ کے مہتمم مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کا ذکر خیر ہے۔ (جاری)

اسلامی فلسفۂ تعلیم

اور استاذ وشاگرد کا رشتہ

انعام اللہ فلاحی،شعبۂ تعلیمات۔مرکز جماعت اسلامی ہند

موبائیل نمبر:08130959045

آج کے اس مادی دور میں ہر چیز مادی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہے، ہر چیز کی اہمیت اور معنویت کا پیمانہ مادی منفعت ہوگیا ہے۔ وہ رشتے جو تقدس کا درجہ رکھتے تھے وہ بھی پامال ہورہے ہیں۔استاذ اور شاگرد کا رشتہ بھی انہیں روحانی اور مبارک رشتوں میں سے ایک ہے۔پوری دنیا میں استاذ اور شاگرد کے رشتے کو نقصان پہنچا ہے۔ ہر ہوش مند اور تعلیم وتربیت کے بارے میں فکر مند شخص اس بارے میں پریشان ہے۔تعلیمی اداروں اوران سے مستفید ہونے والے طلبہ کے اندر روز افزوں اخلاقی زوال محسوس کیا جارہاہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیمی شرح میں اضافہ ہورہاہے۔علوم وفنون کے ماہرین کی تعداد میں بھی بڑا اضافہ ہواہے۔سماج اور معاشرے میں ظاہری اور مادی ترقی ہورہی ہے۔ تعلیمی اداروں سے انجینئر، ڈاکٹر،لیکچرر، پروفیسر،سیاست داں، تاجر اور مختلف فیلڈ کے ماہرین اور محققین کی کھیپ پر کھیپ نکل رہی ہے لیکن وہ افراد نہیں مل رہے ہیں جو مطلوب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیم یافتہ اور سند یافتہ افراد ہی ہیں جن کے ہاتھوں سماج میں کرپشن اور فساد پھیل رہا ہے۔ پڑھے لکھے افراد ہی ملاوٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔تعلیمی اداروں کے سند یافتہ افراد ہیں جو بڑے بڑے اسکینڈل میں پکڑے جاتے ہیں۔فتنہ وفساد کے جتنے کام ہیں وہ کوئی ناخواندہ اور جاہل افراد نہیں کرتے ہیں بلکہ اس طرح کے بیش تر کام تعلیم یافتہ افراد کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تعلیم اور ٹکنالوجی کی ترقی کے باوجود ہمارے سماج میں اندھیرا ہے۔ظلم اور ناانصافی ہے۔رشوت اور کالا بازاری ہے۔ بنیادی اخلاقیات اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکلتا جارہاہے۔خود ہماری حکومت بھی اس کمی کو محسوس کررہی ہے۔ یہ پہلو اس کی

نظر میں بھی نہایت تشویشناک ہے۔حکومت نے ''تعلیم کی چنوتی'' کے نام سے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں اس صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اخلاقی طور پر یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہ تبصرہ بھی ہے کہ اخلاقی قدروں پر سخت دباؤ ہے۔ ہمارا سماج شکست وریخت کا شکار ہے،طلبہ میں خدمت کا جذبہ کم ہورہا ہے۔ مادیت اور مادہ پرستی کا زہر غالب نظر آتا ہے۔ اکبرالہ آبادی اس کا اظہار بہت پہلے ان الفاظ میں کر گئے:

کیا کہیں احباب کیا کارِنمایاں کر گئے
بی اے کیا،نوکر ہوئے،پنشن ملی اور مر گئے

جب تعلیم سامان تجارت بن جائے، مادی منفعت ہی اس کا مقصود ٹھہرے، ایسی صورت حال میں استاذ نہ تو طالب علم کا خیر خواہ ہوتا ہے اور نہ طالب علم کے اندر استاذ کے لیے جذبہ احترام وعقیدت باقی رہتا ہے۔ استاذ اور شاگرد کا تعلق کاروباری بن کر رہ جاتا ہے۔ استاذ، تدریس اور تعلیم کا پیشہ،محض اس وجہ سے اختیار کرتا ہے کہ اس کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی مل جائے۔ شاگرد بھاری فیس دے کر تعلیم حاصل کرتا ہے، اس لیے وہ استاذ کو ایک پیشہ ور شخص اور تاجر سمجھتا ہے۔ اس طرح استاذ وشاگرد کا تعلق ایک مقدس اور پاکیزہ رشتہ کے بجائے کاروباری رشتہ بن کر رہ جاتا ہے۔

استاذ اور شاگرد کے تعلقات کی پستی اور زوال کو اقوام متحدہ کے ادارے یونسکو نے ۱۹۹۴ء میں محسوس کیا۔ محبت وعقیدت کے اس رشتے کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے اس نے بعض اقدامات تجویز کیے۔ اس میں سے ایک اہم فیصلہ ۵/اکتوبر کی تاریخ کو عالمی سطح پر یوم اساتذہ کے طور پر منانے کا تھا۔ اس کے بعد سے ہر ملک، سال میں ایک دن اساتذہ کے عزت واحترام کی یادگار کے طور پر منانے لگا۔ طلبہ اس تاریخ کو عقیدت ومحبت کے پھول اور نذرانے اساتذہ کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ دن ۵/ستمبر کو ماہر تعلیم اور ملک کے دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی یوم پیدائش کی مناسبت سے منایا جاتا ہے۔

استاذ اور شاگرد کے درمیان زوال پذیر تعلقات کو ختم کرنے کے لیے ایک دن منا لینے سے مسئلہ نہیں حل ہوسکتا ہے۔ اس سے نہ تو تعلقات میں بہتری آسکتی ہے اور نہ ہی عقیدت ومحبت کا مطلوبہ جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ان اسباب پر غور کیا جائے جن کی وجہ سے اس رشتہ پر زوال آیا ہے۔ تعلیم کیا ہے؟ تعلیم کا مقصود کیا ہے؟ اساتذہ کے حقوق وواجبات کیا ہیں؟ ان کی حیثیت اور مقام کیا ہے؟ ان کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں؟ طلبہ کی حیثیت اور ان کا مقام کیا ہے؟ ان کی ذات اور سیرت وکردار میں کس طرح کی تبدیلیاں مطلوب ہیں؟

جب تک ان بنیادی سوالات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا اور ان سوالات کی روشنی میں منصوبہ بندی نہیں کی جائے گی محض ایک دن منا لینے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ہمیں نظر آ رہا ہے کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔

تعلیم کیا ہے؟

تعلیم انسان کی ہمہ جہت نشو ونما کا بنیادی ذریعہ ہے انسان کی خفیہ اور خداداد صلاحیتوں کو صحیح سمیت دینا ہے جس کے ذریعہ صلاحیتیں بروئے کار آ سکیں اور انسان با کردار بن کر سماج کی خدمت کر سکے۔

نعیم صدیقی کے الفاظ میں تعلیم ''وہ عمل ہے جس کے ذریعہ ایک نسل اپنی حاصل کردہ معلومات، تجربات، علمی مہارتوں اور اپنے عقائد و اطوار کو نوخیز نسل کی طرف منتقل کرتا ہے۔'' (اساسیات تعلیم: اسلامی تناظر میں، نعیم صدیقی، ص: ۱۵۸)

گاندھی جی کے مطابق تعلیم:

تعلیم کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا ہے: ''تعلیم سے میری مراد بچے اور بالغ آدمی کے جسم، ذہن اور روح میں موجود صلاحیتوں کو باہر لانے سے ہے'' اس کو اور واضح کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ اور لکھا ہے: ''اصل تعلیم وہ ہے جو بچے کی جسمانی، ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو اندر سے باہر لائے اور ان میں نکھار پیدا کرے''۔ (ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم، ص: ۱۴۱)

مولانا آزاد کے مطابق تعلیم کا مفہوم:

مولانا آزاد کا ماننا ہے کہ صلاحیتیں انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ تعلیم کو صرف مناسب ماحول تیار کر کے صلاحیتوں کو صحیح سمت میں نشو ونما دینا ہوتا ہے۔ اس طرح تعلیم پیدائش سے موت تک ہوتی رہتی ہے۔ (ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم، ص: ۱۶۱)

افضل حسینؒ کے مطابق تعلیم کا مفہوم:

تعلیم کا لفظ آتے ہی ذہن عموماً ان منظم کوششوں کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو طلبہ کے لیے تعلیمی ادارے انجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ باضابطہ اور رسمی (FORMAL) تعلیم یہی ہے اور اس کے اثرات بھی بہت دوررس ہوتے ہیں مگر یہ تعلیم کا بہت محدود مفہوم ہے۔ کیونکہ تعلیمی اداروں میں تو بچے بہت کم وقت گزارتے ہیں اور بہت ہی محدود معلومات اور تجربات حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے جاننے اور سیکھنے اور تجربات حاصل کرنے کا عمل پیدائش سے لے کر موت تک برابر جاری رہتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی باضابطہ تعلیم کے علاوہ نہ جانے کتنی باتیں وہ اپنے گھر، محلے، پڑوس، فطری اور سماجی ماحول، اور اپنے

گردوپیش پھیلی ہوئی دنیااوراس میں بسنے والے افراد سے سیکھتے ہیں۔اگرچہ یہ تعلیم غیر رسمی اور بے ضابطہ (INFORMAL) ہوتی ہے لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے باضابطہ تعلیم سے کم نہیں ہے۔اس طرح تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات اور تجربات شامل اور شمار ہوتے ہیں جو گود سے گور تک ہر فرد باضابطہ یا بے ضابطہ خود حاصل کرتا ہے یا اسے حاصل کرائے جاتے ہیں۔(فن تعلیم وتربیت،ص:۲۰)

تعلیم کا مقصد

عام طور پر لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد عمدہ اور بہتر زندگی گزارنا ہے۔ان کی نظر میں زندگی کی مادی سہولتوں کا حصول اور آرام وآسائش کی فراوانی ہی تعلیم کا حاصل ہے۔اس نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم ایک کاروبار ہے جس کے ذریعہ طالب علم بہتر سے بہتر مادی فائدے حاصل کر کے زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اسلام کے نزدیک تعلیم کا مقصد انسان کے اندر سے حیوانیت کے جذبات کو پست کر کے انسان کے نفس کا تزکیہ اور تربیت کرنا ہے،جس کے نتیجے میں انسان اللہ کا ایک صالح بندہ بن کر رضائے الٰہی کو حاصل کر سکے۔انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔تعلیم کے ذریعہ وہ اپنی خلافت کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اوراس کوادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔اس طرح تعلیم وتربیت کا کام ایک عبادت ہے۔

دونوں نقطۂ ہائے نظر میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔پروفیسر محمد سلیم صاحب کے الفاظ میں ’’اسلامی نظام تعلیم میں استاذ اور شاگرد کے نقطۂ نظر اور فکر وفہم،طریق تعلیم اور طرز عمل میں عظیم الشان فرق واقع ہوجاتا ہے،اسلامی نظام تعلیم میں استاذ اور شاگرد دونوں اخلاص وللّٰہیت سے سرشار ہوتے ہیں دونوں پر تقویٰ اور پرہیزگاری کی فضا طاری رہتی ہے۔قناعت وتوکل اوراستغفار کا ماحول نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف مغربی نظام تعلیم میں استاذ اور شاگرد دونوں کا مطمح نظر جلب منفعت اور اغراض پرستی ہوتا ہے۔حصول زر کی تگ ودو سے بلند تر کسی تصور کا ان کے حاشیہ خیال میں کہیں گزر نہیں ہوگا۔(مثالی مسلم اساتذہ اور طلبہ،ص ۱۴)

۳۱؍مارچ تا ۱۸؍اپریل ۱۹۷۷ء کے دوران مکۃ مکرمۃ میں عالمی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد بہت ہی صاف اور واضح الفاظ میں پیش کیا گیا تھا۔یہاں اس عبارت کو نقل کرنا مفید ہوگا:

’’تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی کامل اور متوازن نشو ونما ہے۔اس کا حصول انسان کی روحانی، فکری اور حسی تربیت اور آبیاری سے ممکن ہے۔اس تربیت کے نتیجے میں،ایمان اس کی شخصیت کے ہر

پہلو سے جلوہ گر ہو۔ اسلام کی محبت، قرآن وسنت کی اتباع اور اسلامی اقدار کی تعمیل کا جذبہ صدق دل اور بشاشت ایمان سے جاگزیں ہو جائے، اس طرح اس کی ذات اس منصب عالیہ کی اہل بن جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ اللہ سے موسوم کیا ہے اور جس سے غلبۂ عالم کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

تعلیم اور کردار

ایسی تعلیم، جس کی پشت پر کردار نہ ہو۔ ایسی تعلیم جس کے اثرات انسان کی زندگی اور اس کی سیرت پر نہ پڑیں۔ ایسی تعلیم، جس کی روشنی اس کی زندگی کو منور نہ کرے۔ ایسی تعلیم، تعلیم نہیں جہل ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں باب باندھا ہے "باب العلم قبل القول والعمل" "قول وعمل سے پہلے علم کا باب" امام بخاری کا اشارہ اس طرف ہے کہ قول وعمل کی درستگی کے لیے علم شرط ہے۔ انہوں نے سورہ محمد کی اس آیت سے استدلال کیا ہے "فاعلم أنه لا اله الا الله واستغفر لذنبك وللمومنين وللمومنات" (محمد:۱۹) (اے نبی خوب جان لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔) اس آیت میں علم کا ذکر پہلے ہے اور عمل کا ذکر بعد میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے اثرات عمل وکردار پر پڑنا ضروری ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں یہ بات شامل ہے کہ علم کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ اس طرح کے لوگ جن کے علم اور عمل میں تضاد ہو، ایسے افراد جو زبانی جمع خرچ کرنے والے ہوں ایسے لوگ جو صرف باتیں بنانے والے ہوں، اسلام انہیں منافق بتاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: أتامرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون (البقرۃ:۴۴) کیا تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے۔

حضرت اسامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "معراج کی رات میں میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے کہا کہ جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا: یہ آپ کی امت کے وہ مقررین ہیں جو وہ کہا کرتے تھے جو خود کرتے نہیں تھے"۔ (مسلم)

یہودیوں کے پاس تورات کا علم تھا لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کی مثال اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں گدھوں سے دی ہے:

"مثل الذين حملوا التوراة ثم لم يحملوها كمثل الحمار يحمل

اسـفـارا“ (الجمعۃ:۵)(جن لوگوں کوتورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا۔ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لادی ہوئی ہوں۔)

ایسی تعلیم اور ایسا علم جس کے اثرات انسانی زندگی اور اس کے کردار پر نہ پڑیں وہ بے سود ہے۔ حقیقی علم وہی ہے جو کردار کو بدلے۔شاعر کہتا ہے ؎

والعلم یجلو العمی عن قلب صاحبه

کما یجلی سواد الظلمة القمر

علم سے دلوں کے اندر زندگی پیدا ہوتی ہے جس طرح مردہ اور خشک و بے جان زمین کو بارش سے زندگی ملتی ہے۔حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:”اے پرور دگار میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو فائدہ نہ پہنچائے۔ایسے دل سے جس میں تیری خشیت اور تیرا خوف نہ ہو۔ایسے نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جسے قبولیت کا درجہ نہ مل سکے“۔(مسلم)

ایسی تعلیم اور ایسا علم جس کا انسانوں کے کردار پر اثر نہ پڑے۔جس سے عملی طور پر فائدہ نہ ہو، وہ فتنہ ہے۔اس سے دنیا میں بھی تباہی ہے اور آخرت میں بھی۔

اساتذہ اور معلمین کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

معلم کا منصب اور مقام کا رسالت سے جڑا ہوا ہے۔اس لیے یہ پیشہ نہایت مقدس اور ذمہ دارانہ ہے۔معلم کا کام تعلیم وتدریس ہے۔آنحضرت کی ذمہ داری قرآن مجید میں بتائی گئی ہے:

یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة ،(ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے،ان کا تزکیہ اور تربیت کرتا ہے،اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

آپؐ نے فرمایا:” بعثت معلماً “(مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔)

معلم اور مدرس کو پہلے اپنے منصب اور مقام کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔اس کے اندر اپنے پیشہ کے لیے اعزاز اور شرف کا احساس ہونا چاہیے۔اس کا دل نہ صرف اس کام سے مطمئن ہو بلکہ اندرون سے اس کام کے لیے خوشی اور انشراح کی کیفیت ہو۔تعلیم ،معلومات کو ایک ذہن سے دوسرے ذہن و دماغ میں منتقل کر دینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک روحانی اور تخلیقی عمل ہے۔اس میں استاذ کی دلچسپی، اس کی شخصیت پورے وقار کے ساتھ اس پیشہ سے وابستہ ہونا لازمی ہے۔معلم نے کسی بھی لمحہ اپنے پیشہ کو حقیر اور بے وزن سمجھ لیا،تو اس کی معلّمی کی روح فنا ہو جاتی ہے۔اس کی تعلیم اور تدریس بے وقعت اور بے وزن ہو جاتی ہے۔

معلم کے ذمہ جس مضمون یا کتاب کی تدریس ہو، اس سے اس کی وابستگی اور گہرا شغف ہونا

چاہیے۔ ذہنی اور فکری ہم آہنگی اور یکسوئی ہونی چاہیے۔ معلم کا اندرون اس سے مطمئن ہونا چاہیے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے: ''کان خلقه القرآن''، (ان کا اخلاق و کردار قرآن تھا)۔ وہ قرآن مجید کی عملی تصویر تھے۔ قرآن ان کے دل و ضمیر میں اترا ہوا تھا۔ ان کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا تھا۔ اس کتاب کا عرق ان کے خون میں رواں دواں تھا۔ معلم کو بھی اپنے مضمون اور کتاب سے ایسا ہی شغف اور وابستگی ہونی چاہیے ہے۔ اگر معلم کو اپنے مضمون سے دلچسپی نہ ہو تو تدریس و تعلیم بے جان اور بے وزن ہو جاتی ہے۔ معلم اس کا حق نہیں ادا کر سکتا ہے۔ نہ ہی طلبہ کی توجہ اور دلچسپی کو اپنی طرف موڑ سکتا ہے۔ نہ ہی اخلاق و کردار کا کوئی نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

معلم کے اندر صبر اور استقامت کا ایک وافر حصہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ تعلیم و تربیت کا کام نہایت پتہ ماری کا اور صبر آزما کام ہے۔ اس راہ میں قدم قدم پر دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ایسے مواقع اور حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جن میں تھڑ دِلے اور بے صبرے لوگوں کے اندر مایوسی اور الجھن پیدا ہونے لگتی ہے اور صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ محمد ﷺ کی راہ میں کتنے ہی سنگ گراں حائل ہوئے، جبر و ظلم کی کتنی ہی آندھیاں چلیں، تشدد اور دل آزاری کے بے شمار حربے استعمال کیے گئے لیکن آپؐ اپنی راہ پر صبر و استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ آپؐ نے مخاطب کو آگاہ کر دیا کہ ''اگر تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج لا کر رکھ دو تو بھی میں اپنے کام سے باز نہیں آؤں گا''۔

تعلیم و تربیت کا کام مشنری کام ہے۔ اس لیے صبر و استقامت کی یہی کیفیت اس میں بھی مطلوب ہے۔ چڑچڑے اور عجلت پسند افراد اس میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ہیں۔

معلم کو اپنے شاگردوں کا بہی خواہ ہونا چاہیے۔ ان کی کامیابی کا متمنی رہنا چاہیے۔ جس طرح ماں باپ اپنے نافرمان بچے کو بھی کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح استاذ اپنے شاگردوں کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے بلکہ اس کی خوشی تو ماں باپ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ استاذ کی مثال ایک ایسے باغبان کی ہوتی ہے جو پودا لگانے اور اس کی دیکھ ریکھ کرنے، اور اس کو پروان چڑھانے نیز پھولوں اور پھلوں سے مالا مال دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ ان پودوں سے فطری محبت اور انس رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کے بقول استاذ ایک صنعت گر ہے جو انسان کی روحانی صنعت گری کرتا ہے۔ یہ معاشرے کا سب سے مشکل کام ہے۔ استاذ کے ہاتھوں میں خدا کی اشرف المخلوق کی تعلیم و تربیت کا کام ہوتا ہے جو ایک مقدس امانت ہے۔

شیخ مکتب ہے ایک عمارت گر
جس کی ضرورت ہے روح انسانی

معلم اپنے طلبہ اور شاگردوں کے لیے محبوب ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت، اس کے عادات واطوار، اس کا وقار اور متانت، اور مزاج طلبہ کی نظر میں قابل تقلید ہوتا ہے۔ طلبہ اپنے استاذ کی تقلید اور پیروی کرتے ہیں۔ جو کچھ انہیں اساتذہ کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اسے عملی طور پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

طلبہ انہی اساتذہ سے محبت کرتے ہیں جو طلبہ کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی مدد کرتے ہیں۔ طلبہ سے شفقت ومحبت سے پیش آتے ہیں، حضرت علیؓ کا قول ہے: من لانت کلمته وجبت محبته ''جس کا انداز گفتگو شیریں اور نرم ہوگا اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں اتر جائے گی اور وہ اس کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے۔ (آداب طالب علم، ص:۴۹)

طلبہ کے دلوں کو مسخر کرنے کا یہ بہترین نسخہ ہے کہ طلبہ سے نرمی اور شفقت ومحبت سے پیش آیا جائے۔ ان کی عزت نفس کا پورا خیال رکھا جائے۔ گویا استاذ کو اس شعر کا مصداق ہونا چاہیے ؎

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

رسول اللہ ﷺ صحابہ کے لیے بہت نرم خو تھے۔ قرآن مجید نے آپ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے: ''فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك، فاعف عنهم واستغفرلهم وشاورهم في الأمر'' (آل عمران:۱۵۹) (یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت ہی نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ کہیں اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو۔ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔)

ایک معلم کو طلبہ کی نظر میں کیسا ہونا چاہیے اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

☆ ملت کا معمار ہونے کی حیثیت سے معلم کو اعلیٰ سیرت وکردار کا حامل ہونا چاہیے۔

☆ اس کے لباس اور وضع وقطع میں سادگی کے ساتھ وضع داری ہو۔

☆ طلبہ سے برتاؤ میں عدل وانصاف اور مساوات کو ملحوظ رکھے۔

☆ سزا دینے میں محتاط ہو، غیظ وغضب، ڈانٹ وپھٹکار، طعن وتشنیع سے کام لینے کے بجائے، طلبہ کے جذبات اور عزت نفس کا خیال رکھے اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔

☆ خود محنت سے پڑھائے اور طلبہ سے بھی محنت کروائے اور کھیل کا بھی موقع دے۔

☆ ہوم ورک ضرور دے مگر بہت لوڈ نہ ڈالے۔ہوم ورک اور دیگر تحریری کاموں کو بروقت جانچ دیا کرے اور اصلاح کے بعد کاپیاں واپس کر دیا کرے۔

☆ پڑھاتے وقت طلبہ کی دلچسپی اور توجہ کا خیال رکھے اکتاہٹ نہ پیدا ہونے دے۔

☆ سادہ، آسان زبان اور دل کش انداز میں باتیں سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

☆ لب ولہجہ شیریں ہو، تلخ باتوں کو بھی گوارا کرے جھگڑالو بالکل نہ ہو۔

(افضل حسینؒ ایم اے ایل ٹی، فن تعلیم وتربیت، ص:۳۰۷، ۲۰۱۵ء)

معلم کو اپنے زیر تعلیم و تربیت طلبہ کی صلاحیتوں اور میلانات سے واقف رہنا چاہیے تاکہ طلبہ کی صلاحیتوں اور ذہنی میلانات کے مطابق ان کی رہنمائی کرسکے۔طلبہ کے مزاجی تنوع اور ذہنی انفرادیت اور اکتساب کی قوت کے مطابق فیلڈ اور میدان کی طرف ان کو متوجہ کرسکے۔رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صحابہؓ کے ذہنی وفکری رجحانات اوران کے فطری میلانات کے مطابق رہنمائی فرمائی اور مردم شناسی کی اس بنیادی صفت سے آپ نے اس ناتراشیدہ معاشرے سے ایسے ایسے جوہر پروان چڑھائے جنہوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی۔آپ کا وطیرہ تھا کہ صحابہ کی خوبیوں کی نشاندہی فرماتے،ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔حضرت ابوبکرؓ کو صدیق،حضرت عمرؓ کو فاروق،حضرت عثمانؓ کے دو القاب ''غنی'' اور'' ذوالنورین''،حضرت علیؓ کو فاتح خیبر،حضرت سلمۃ بن اکوع کو''بطل المشاۃ''(بہادر پاپیادہ)،حضرت زبیر بن العوامؓ کو''حواری''،حضرت حنظلہؓ کو''غسیل الملائکۃ''، حضرت معاذ ابن جبلؓ کو حلال وحرام کا سب سے بڑا عالم، جبکہ ابوعبیدہؓ کو اس امت کا امین،حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو حضرت داؤد کی بانسری،حضرت خدیجہؓ کو طاہرہ،حضرت عائشہؓ کو صدیقہ، فاطمہؓ کو الزھراء اور زینب بنت خزیمہ کو ام المساکین کے خطاب اور القاب سے نوازا،اس سے ان کی خوبیوں کا اعتراف اور ہمت افزائی مقصود تھی۔ حضرت حسانؓ کے اندر شعروشاعری کے جوہر دیکھے تو ان کی اس صفت کی تعریف کی اوران کی اس میدان میں آگے بڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی۔

ایک اچھے استاذ کو بھی اپنے طلبہ کی صلاحیتوں کے مطابق رہنمائی کرنی چاہیے۔استاذ کی رہنمائی اور اشارہ پر شاگردوں نے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔دو مثالوں کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

امام بخاریؒ صحیح البخاری کی تصنیف میں تین اسباب کا ذکر کرتے ہیں۔ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ''ان کے استاذ اسحاق بن راھویہ کا حلقہ درس چل رہا تھا،انہوں نے ایک دن کہا کہ ''لـــــو أن أحدكم يجمع كتابا فيما صح من سنة رسول الله ﷺ ''(کاش تم میں سے کوئی شخص نبی کریم

ﷺ کی صحیح احادیث پر مشتمل کتاب تصنیف کرتا۔)اس جملے نے امام بخاری کے ذہن کی پرتوں کو کھول دیا۔اس ایک جملے نے انہیں عزم وحوصلے کا پہاڑ بنادیا۔اس عظیم کتاب صحیح البخاری کی تصنیف میں ہر طرح کی پریشانی اور الجھن کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا اور ایسی کتاب تالیف کی جس کو امت میں انتہائی پذیرائی ملی۔اس کے بارے میں علمائے امت کا اتفاق ہے کہ أصح الكتب بعد كتاب الله،اس شہرۂ آفاق کتاب نے انہیں رہتی دنیا تک کے لیے زندہ وجاوید بنادیا۔

دوسری مثال امام ذہبیؒ (۶۷۳۔۷۴۸ھ) کی ہے۔ذہبیؒ امام، حافظ، محدث اکیلے اپنی ذات میں ایک اکیڈمی ایک مدرسہ تھے۔ذہبی نام اس وجہ سے پڑا کہ فن اسماء الرجال میں لوگوں کو ایسے ہی وزن کرتے تھے جس طرح جوہری سونے کو وزن کرتا ہے۔امام ذہبی کی تصانیف میں مشہور تصانیف اس طرح ہیں:

(۱)التاریخ الکبیر ثم الاوسط والصغیر ۲۰/ جلدوں میں۔(۲) سیر اعلام النبلاء ۲۵/ جلدوں میں۔
(۳) تذکرۃ الحفاظ ۱۲/ جلدوں میں۔(۴) میزان الاعتدال فی نقد الرجال ۳/ جلدوں میں۔

امام ذہبی کا بیان ہے کہ علم حدیث کی طرف ان کی رغبت اور اس علم سے ان کا شغف اس وجہ سے ہوا کہ ان کے استاد محترم ''البرزالی'' نے ان کی تحریر دیکھ کر فرمایا ''ان خطك هذا يشبه خط المحدثين' تمہاری یہ تحریر تو محدثین عظام کی تحریروں سے مشابہ ہے۔امام کہتے ہیں ''فحبب لی علم الحدیث '' استاد محترم کے اس جملہ کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ اللہ نے حدیث کے علوم کی محبت میرے دل میں بیٹھادی۔

شاگرد کامقام

طالب علم اور شاگرد کو اپنے مشن اور مقصد میں مخلص ہونا چاہیے۔اس کے لیے اسے علم کی اہمیت اور فضیلت سے واقف ہونا چاہیے۔تعلیم اور علم کے آداب اور سلیقے سے طالب علم اور ان کے سرپرستوں کو بھی آگاہ ہونا چاہیے۔امام مالکؒ جب سن شعور کو پہنچے تو ان کی والدہ نے انہیں اچھالباس پہنایا اور بچے سے کہا ''اذهب الى ربيعة و تعلم من ادبه قبل علمه ''(امام ربیعہؒ کے حلقہ درس میں جاؤ اور حصول علم سے پہلے آداب علم سیکھو۔)

طالب علم کے دل میں اپنے استاد کا احترام اور تعظیم ہونی چاہیے۔اسے استاذ کی عزت وتوقیر کرنی چاہیے۔استاذ کو اپنا محسن اور روحانی باپ تصور کرنا چاہیے۔استاذ کے سامنے سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔حصول علم میں سنجیدگی کا اہم مقام ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:''تعلموا العلم و تعلموا للعلم السكينة والوقار ''(علم حاصل کرو اور حصول علم کے لیے سنجیدگی اور وقار کو اختیار کرو)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ:أمرنا رسول اللہ ؐ ان ننزل الناس منازلھم (اللہ کے رسولؐ نے ہمیں حکم دیا کہ لوگوں کے ساتھ ان کے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے پیش آ ؤ۔مسلم)

علماء اور اہل علم کی پہچان تواضع اور خاکساری سے ہوتی ہے، پاک باز اور حقیقی علماء کا کبر وغرور اور خود پسندی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔انہیں اس بات کا احساس رہتا ہے کہ ''فوق کل ذی علم علیم ''(ہر صاحب علم وفن سے بالاتر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہے)۔ان کے سامنے یہ تعلیم بھی ہوتی ہے''وما أوتیتم من العلم الا قلیلا''(انسان کو علم کا بہت ہی تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔)

انسان کے اندر جس قدر علمی گہرائی اور وسعت ہوگی اس کے اندر تواضع اور خاکساری اتنی ہی زیادہ ہوگی۔اس کی مثال امام مالکؒ کی زندگی ہے۔

جب خلیفہ ابو جعفر منصور نے امام مالکؒ سے کہا کہ میرا یہ ارادہ ہے کہ موطاً کی مختلف نقلیں تیار کروا کر تمام مسلم علاقوں میں بھیج دوں کہ سارے لوگ اس کے مطابق عمل کریں اور دوسری روایتوں کو چھوڑ دیں اس لیے کہ مدینہ میں حدیث کے مطابق عمل ہے اور یہ حق اہل مدینہ کو ہی ہے۔اس طرح اختلاف ختم ہو جائے گا۔

امام مالک نے عباسی خلیفہ کو ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ایسا نہ کیجئے۔لوگوں کے پاس مختلف صحابہ سے روایتیں پہنچی ہیں وہ اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔(جامع بیان العلم)

امام غزالیؒ کے بقول استاد کا حق والدین کے حق سے بھی زیادہ ہے اس لیے کہ والدین اس کو فانی دنیا میں وجود میں لانے کا سبب اور ذریعہ بنتے ہیں جبکہ استاد دائمی اور ابدی زندگی کی کامیابی کا ذریعہ اور سبب ہوتا ہے۔وہ طالب علم کے لیے درج ذیل آداب ضروری بتاتے ہیں:

۱۔مال ودولت،عہدے،فخر وغرور اور دوسروں پر اپنی برتری کے لیے علم نہ حاصل کرے۔بلکہ دنیا میں اپنی اصلاح اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو علم کا مقصد بنائے۔

۲۔کسی میدان میں اس وقت تک قدم نہ رکھے جب تک اس کے مبادیات اور اصول وقواعد کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔پہلے اس میدان کے متعلق ابتدائی معلومات جمع کرے اس فیلڈ کے ماہرین سے مشورہ کرے پوری طرح شرح صدر کے بعد اس میدان میں لگ جائے۔

۳۔علم پر تکبر نہ کرے خصوصاً استاذ کے سامنے ادب سے پیش آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا''لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف شرف کبیرنا''۔ابوداؤد/ترمذی(جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے

وہ ہم میں سے نہیں ہے)

طلبہ کے اپنے اساتذہ کے تئیں عقیدت ومحبت اور عزت واحترام کی بہت سی مثالیں ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ان مثالوں سے ہماری نسلِ نو کو واقف کرانا چاہیے ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی مجلسِ درس بڑی باوقار ہوتی تھی۔تمام طلبہ باادب بیٹھتے تھے یہاں تک کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی آہستہ سے الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ پیدا ہو جس سے استاد محترم کو تکلیف پہنچے۔

امام قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے نماز پڑھی ہو اور اپنے استاد سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے لیے دعا نہ کی ہو۔

شاگرد کے گھر والوں کا بھی وظیفہ جاری کیا

امام ابو یوسفؒ کا نام یعقوب تھا۔ان کے والدین بوڑھے ہو چکے تھے۔والد مزدوری کرتے تھے۔ بڑھاپے میں یہ کام ان کے لیے ممکن نہیں رہا، ذریعہ معاش اور کچھ نہیں تھا۔والدین کی خواہش تھی کہ بیٹا کسی طرح جلد برسرروزگار ہو جائے۔ایک دھوبی کے یہاں لگا دیا تا کہ کچھ کام بھی سیکھ لے اور کچھ رقم بھی مل جایا کرے۔یعقوب گھر سے نکلتے، راستے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک مسجد میں درس دیتے تھے، وہیں پر وہ رک جاتے تھے۔جب والدین کو پتہ چلا کہ کام کے بجائے کسی درس گاہ میں پڑھنے جاتا ہے تو دونوں بہت دکھی ہوئے۔ان کی والدہ اس درس گاہ تک پہنچ گئیں۔وہاں ایک بڑے میاں کو دیکھا تو ان سے کہا:''حضرت یہ میرا لڑکا ہے۔میں سوت کات کر کماتی ہوں اور اسے پالتی ہوں۔میں نے اس کو کمائی کے لیے ایک دھوبی کے پاس نوکر رکھ دیا تھا مگر یہ آپ کے پاس چلا آتا ہے۔اس کا باپ بوڑھا ہے وہ کوئی آمدنی نہیں کرسکتا ہے۔اس کو سمجھایئے کہ ہم غریب لوگوں کے لیے تعلیم نہیں ہے۔ہم محنت مزدوری کر کے موٹی جھوٹی روٹیاں کسی طرح کھاسکیں، یہ ہمارے لیے ضروری ہے۔

یہ سن کر حضرت امام ابوحنیفہ مسکرائے اور بولے:''اس لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔تم اسے روکھی سوکھی روٹیاں کھلانا چاہتی ہو اور یہ پستہ کے تیل سے بنا ہوا فالودہ کھانا چاہتا ہے۔''

بڑھیا ناراض ہو کر چلی گئی۔امام ابوحنیفہؒ نے اس بڑھیا کے گھر کا پورا خرچ اپنے ذمہ لے لیا۔ایک بڑی رقم یعقوب کے والدین کو دینے لگے۔یہی یعقوب بعد میں چل کر امام ابو یوسف بنے۔خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال وآراء کے امین ومحافظ اور شارح بنے۔

طالب علم سے اپنی لڑکی کی شادی کردی

حضرت سعید بن مسیّب سید التابعین تھے۔ اپنے ایک غریب شاگرد ابو وداع جو چند دنوں تک ان کے درس سے غیر حاضر تھے، جب دوبارہ وہ آئے تو غیر حاضری کی وجہ معلوم کی تو انہوں نے بتایا کہ بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ سعید بن مسیّب نے تعزیت فرمائی اور کہا کہ انتقال کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ جنازہ میں میں بھی شریک ہوتا۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ کیا دوسری شادی کا ارادہ ہے؟ ابو وداع نے کہا کہ میں کیسے شادی کرسکتا ہوں میرے پاس تو صرف دو درہم ہیں۔

حضرت نے اس غریب لڑکے سے اپنی بچی کی شادی کردی۔ یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے خلیفہ عبدالملک نے اپنے بیٹے ولید کے لیے پیغام دیا تھا جس کو سعید بن مسیّب نے ٹھکرا دیا تھا۔

استاذ کے ساتھ شاگرد بھی جیل میں

حافظ ابن القیم الجوزیۃ کے استاد محترم امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ عزیز شاگرد نے مطالبہ کیا کہ استاد کے ساتھ اس کو بھی قید خانہ بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بھی قید خانے چلے گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ قید خانے میں بھی جاری رہا۔ (مثالی مسلم اساتذہ اور طلبہ، ص ۹۹)

وائس چانسلر شاگرد نے نابینا استاد کو نہلایا

سر راس مسعود سر سید کے پوتے جسٹس محمود کے بیٹے ۱۹۳۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے۔ ایک دن یونیورسٹی کے تمام اداروں کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔ یونیورسٹی کا عملہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ظہور وارڈ میں پہنچے جہاں چھوٹے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں ایک نابینا حافظ جی سے ملاقات ہوئی، جنہوں نے سر راس مسعود کو قرآن مجید پڑھایا تھا۔ سر راس مسعود نے آگے بڑھ کر حافظ جی کو سلام کیا۔ حافظ جی نے سر راس مسعود کی آواز پہچان لی اور کہا: بیٹا مسعود اب کیا کر رہے ہو؟ لوگوں نے بتلایا کہ اب وائس چانسلر بن گئے ہیں۔ حافظ جی نے پوچھا یہ کیا ہوتا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ استاد الاساتذہ۔ حافظ جی نے کہا اب میرا بیٹا سب سے بڑا استاد بن گیا ہے۔ راس مسعود نے دریافت کیا: حافظ جی کوئی حاجت ہے؟ حافظ جی نے سابقہ بے تکلفی میں کہا: بیٹا کئی ہفتوں سے نہایا نہیں ہے، تو مجھے نہلا دے۔ لائق شاگرد نے اسی وقت کوٹ اتارا اور استاد کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا کیا۔ حافظ جی نے جی بھر کر دعائیں دیں۔ (مثالی مسلم اساتذہ اور طلبہ، ص: ۱۰۱)

شاگرد نے نوبل انعام استاد کے قدموں میں ڈال دیے

پروفیسر عبدالسلام بیان کرتے ہیں: میں جھنگ کالج میں ۱۹۳۸ء میں ۱۲/ برس کی عمر میں داخل ہوا۔ چار سال یہاں گزارے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ نویں دسویں فرسٹ ایر اور

سکنڈ ایر کی کلاسیں تھیں ۔ کثرت ہندو طلبہ کی تھی ۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق استاذ ملے ۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین مرحوم تھے ۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق، فارسی کے استاد خواجہ معراج الدین، حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے ۔ حساب میں بدری ناتھ اور لالہ رام لال، فزکس کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ نوبت رائے تھے ۔

میرے تعلیمی کیریئر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی مفید کامیابیاں اسی کالج کی تعلیم اور میرے جھنگ کے استادوں کی شفقت کی مرہون منت ہیں ۔ میرا ایمان ہے کہ استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے ۔ (ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، یکم جنوری ۱۹۸۶ء)

۱۹۷۹ء میں جب انہیں نوبل انعام ملا تو ان کے ایک ہندو استاد، جو کلکتہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے جھنگ میں انہیں تعلیم دی تھی، وہ ان سے ملنے کلکتہ گئے ۔ ان دنوں وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے ۔ نوبل انعام ان کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا: کہ آپ اسے قبول کر لیجئے، کیونکہ یہ آپ کی تعلیم و رہنمائی کی وجہ سے ہی مجھے ملا ہے ۔ استاذ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے مبارک باد دی اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ انہیں واپس کیا ۔

خلاصۂ کلام

اساتذہ کی محبت اور ان کا احترام طلبہ میں اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اساتذہ اپنا منصب اور مقام صحیح معنوں میں پہچانیں ۔ طلبہ اور شاگردوں سے شفقت اور محبت کا رویہ اختیار کریں ۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے مقصد اور اس کی حقیقت سے اساتذہ اور طلبہ کو آگاہ اور روشناس ہونا چاہیے ۔ تعلیم سے انسان کی زندگی میں کیا تبدیلیاں اور اثرات مطلوب ہیں، اس سے بھی انہیں واقف ہونا چاہیے ۔ طلبہ اپنا مقام اور اپنی حقیقت کو سمجھیں، بڑوں کی عزت و احترام اور ادب کرنا سیکھیں ۔ بڑوں کے احسانات کے لیے شکر گزاری اور احسان مندی کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو ۔ یہ وہ ضروری باتیں ہیں جن کے بغیر طلبہ کے اندر اپنے اساتذہ کے لیے عقیدت و محبت نہیں پیدا ہو سکتی ہے، صرف یوم اساتذہ منا لینے سے نہ وہ جذبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی اس کا مقصد حاصل ہوگا ۔

نئ بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کے آستیں خالی

پرانی یادیں

ہمارے زمانے کا جامعہ

طیب حسن فلاحی، ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ آفیسر پنجاب وقف بورڈ،
ای میل:t.hfalahi@ymail.com

*(گزشتہ شماروں میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۸۲ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک برادر بزرگ کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر**)*

میں نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں جامعۃ الفلاح کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا اور عالمیت وفضیلت کی سند حاصل کرتے ہوئے ۱۹۸۲ء میں جامعہ سے فراغت حاصل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بی اے (ہسٹری) میں داخلہ لیا، اور اسی یونیورسٹی سے ہسٹری ہی سے ایم اے بھی کیا۔

ہمارے والدین جماعت اسلامی ہند کے ارکان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مجھے دینی تعلیم کے لیے ایسے ادارے میں بھیجیں جہاں تحریک اسلامی کا اثر ہو۔ اس لیے انہوں نے جامعۃ الفلاح کا انتخاب کیا۔

جس وقت میں نے جامعۃ الفلاح میں داخلہ لیا تھا اس وقت جامعہ کا ماحول بہت ہی اچھا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی اجنبی ماحول میں نہیں ہیں، بلکہ یہاں پر سب ہی اپنے ہی افراد ہیں۔ جامعہ اس وقت تمام مدارس سے الگ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت جامعہ میں مقیم طلبہ کی تعداد ۲۵۰ رتھی اور اساتذہ کی تعداد تقریباً بیس سے پچیس تھی۔ جب میں نے داخلہ لیا تو اس وقت دارالاقامہ تقریباً چالیس پینتالیس کمروں پہ مشتمل تھا۔ اسی سے لگتی ہوئی ایک بڑی عمارت تھی جس میں درس وتدریس کے لیے تقریباً بیس پچیس کمرے تھے۔ اسی عمارت کی پہلی منزل پہ ایک بڑے ہال کی صورت میں ایک شاندار لائبریری تھی

اور زمینی منزل پہ ایک بڑا ہال تھا جس میں اجتماعی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ اسی عمارت کے کمروں میں کچھ بزرگ اساتذہ کرام رہائش پذیر تھے۔ یہ عمارتیں نہایت سادہ انداز سے بنی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح جامعہ میں سادگی کا ماحول تھا اسی طرح یہ عمارتیں بھی سادہ تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے وقت میں ایک پرائمری شاخ کی تعمیر بھی ہوئی تھی۔

دارالاقامہ میں ہم لوگ بہت ہی سادہ انداز میں رہتے تھے۔ ایک کمرے میں تقریباً چار سے پانچ لڑکے رہا کرتے تھے اور ہر سال کمرہ تبدیل کردیا جاتا تھا۔ وہ منظر بھی بڑا دلچسپ ہوا کرتا تھا جب کمروں کی تبدیلی کا اعلان ہوتا تھا تو ہم میں سے ہر کسی کی خواہش ہوتی تھی کہ جو کمرہ ہمارے لیے نامزد کیا گیا ہے اس میں فوری طور پر جا کر اچھی سی جگہ پر قبضہ کرلیا جائے۔ اعلان ہوتے ہی ہم لوگ بھاگ کر جاتے اور کمرے میں اچھی جگہ پر قبضہ کی کوشش کرتے۔

اس وقت طعام کا بھی بہت اچھا انتظام تھا۔ کھانا کھلانے کی ذمہ داری جمعیۃ الطلبہ کی ہوتی تھی۔ جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے طلبہ کی کھانا کھلانے کی باری لگائی جاتی تھی۔ کھانے میں عام طور سے ناشتہ میں چنے اور دوپہر میں دال روٹی اور چاول ہوتے تھے۔ کہنے کو تو دال ہوتی تھی لیکن جن لوگوں کو دال کا اوپری حصہ مل جاتا تھا اسے کسی اور سبزی کی حاجت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت کی دال نہایت لذیذ ہوا کرتی تھی۔ شام کے کھانے میں اکثر سبزی یا گوشت اور بدھ کے روز بطورِ خاص بکرے کا گوشت ملتا تھا۔ کھانا مطبخ کے اندر ہی طعام ہال میں کھلایا جاتا تھا۔ فرش پہ لمبا دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا اور اس پر پلیٹیں لگا دی جاتی تھیں۔ جن طلبہ کی باری ہوتی تھی وہ مطبخ میں پہلے آجاتے تھے اور دوسری گھنٹی پہ تمام طلبہ طعام ہال میں پہنچ جاتے تھے۔ طلبہ کے بیٹھنے کے بعد دسترخوان پر کھانا لگا دیا جاتا تھا اور اس کے بعد ایک انگلی کے اشارے سے روٹی، دو سے دال وغیرہ طلب کی جاتی تھی تا کہ شور ہنگامہ نہ ہو۔ کوئی بدنظمی نہیں ہوتی تھی، جبکہ یہ سارا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی نگراں حضرات بھی تشریف لے آتے تھے۔

جب میں نے جامعہ میں داخلہ لیا تھا اس وقت جامعہ کی عمر اتنی ہی تھی جتنی اس وقت ہماری تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ اس وقت بالکل ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا، لیکن اس وقت میں نے یہ بالکل محسوس نہیں کیا کہ جامعہ کا قیام ابھی کچھ سال پہلے ہوا ہے۔ قابل ترین اساتذہ کرام اور بہترین نظام تعلیم وتربیت کو دیکھتے ہوئے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ جامعہ ابھی بالکل ہی نوخیز پودا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ کو جو اساتذہ ملے تھے وہ پہلے بڑی درسگاہوں میں درس وتدریس کا کام انجام دے چکے تھے۔ اور تقریباً اساتذہ تحریک اسلامی سے وابستہ تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس

جامعہ کو بھی ایک تحریک کی شکل دینے کی کوشش کی اور تحریکی انداز میں درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کا نظام قائم کیا۔

ان میں سے کچھ اساتذہ کرام ایسی جگہوں سے آئے تھے جہاں وہ کھل کر طلبہ کے اندر تحریکی روح نہیں پھونک سکتے تھے۔ اب یہاں انہیں پورا موقع ملا کہ وہ اپنی تحریکی فکر کو درس وتدریس کے دوران طلبہ میں منتقل کرسکیں۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے ہم لوگ تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتے گئے تحریکی ذہن خود بخود بنتا گیا۔

جامعہ کا طویل تعلیمی سفر اپنے اندر بے انتہا خوش گوار اور ناخوش گوار واقعات بھی رکھتا ہے۔ بہت ابتدائی دور کی بات ہے جب میں درجہ پانچ پاس کر کے چھٹی جماعت میں آیا، اس وقت میں کچھ ایسے طلبہ کے ساتھ رہنے لگا جو پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ میں بھی انہی جیسا ہو گیا۔ قصہ مختصر میرا دل بھی پڑھنے سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ ہمارے علاقے کے کچھ باثروت گھرانوں کے بچے جن کا دل جامعہ میں نہیں لگ رہا تھا انہوں نے باقاعدہ ذمہ داران سے اجازت لے کر جامعہ چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ پتہ نہیں مجھے بھی کیا ہو گیا تھا کہ میں نے بھی ارادہ کرلیا کہ میں بھی یہاں نہیں پڑھوں گا اور ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں گا۔ پروگرام طے ہو گیا۔ وہ لوگ باقاعدہ اجازت کے ساتھ جارہے تھے اور میں خفیہ طور سے جانے کی کوشش میں تھا۔ جس وقت یہ طلبہ جارہے تھے اتفاق سے اُسی وقت دارالاقامہ کے نگراں مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب مرحوم جو اس قدر سخت تھے کہ طلبہ ان کو دیکھ کر ہی کانپنے لگتے تھے دارالاقامہ کے وسط میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لڑکے تو اجازت لے کر جارہے تھے اس لیے وہ آرام سے نکل گئے پر مجھے دیکھتے ہی مولانا نے بلالیا۔ پوچھا کہاں جارہے ہو۔ میں نے کہا میں ان لوگوں کے ساتھ گھر جارہا ہوں۔ پوچھا کیوں۔ کہا میری طبیعت پڑھائی میں نہیں لگتی۔ میں نے کہا کہ مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب کلاس میں بہت پٹائی کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا کہ میں ان سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہاری پٹائی نہ کریں۔ اتنے سخت نگراں کا اس نرم لہجے میں بات کرنا مجھ پر اس قدر اثر کرگیا کہ میں نے گھر جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ حالانکہ کلاس میں مولانا مطیع اللہ صاحب کا جو رویہ تھا اس میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی، تاہم مولانا شبیر صاحب کی یہ بات ہماری زندگی کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔

شاید اللہ تعالی کو ہماری بہتری منظور تھی اور ہمارے والدین کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہونی تھی اس لیے مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب نے ہماری اس تدبیر کو ناکام بنادیا۔ آہستہ آہستہ اللہ تعالی کی توفیق

وکرم سے میرا ذہن بدلنے لگا اور میں جامعہ کے تعلیم وتربیت کے نظام میں ڈھلتا چلا گیا۔ جوں جوں درجات پاس کرتا گیا، تعلیم میں دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔ آج بھی مولانا شبیر صاحب مرحوم کے لیے دل دعا نکلتی ہے۔

ہم طلبہ جامعہ کے درمیان اتحاد واتفاق بھی خوب تھا۔ بزرگ طلبہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ برادرانہ ومشفقانہ سلوک کرتے تھے۔ ہم لوگ اپنے سینئرس کو بڑے بھائی کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور جب ہم لوگ سینئر ہوگئے تو ہم نے بھی اسی روایت کو جاری رکھا۔

جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان رشتہ بہت خلوص اور محبت پر مبنی تھا۔ طلبہ اپنے اساتذہ کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور اساتذہ کرام بھی طلبہ کے ساتھ بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ہمیں اس وقت یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اساتذہ کرام کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ طلبہ کے اندر وہ سب علم منتقل ہوجائے جوان کے پاس ہے۔ بہت ہی کھلے ماحول میں تدریسی عمل جاری رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ طلبہ اساتذہ کی رائے سے متفق نہیں ہوتے تھے، اس پر بھی اساتذہ کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے، بلکہ بہت ہی کھلے دل سے کہتے کہ آپ کو جو رائے مناسب لگے اسے اختیار کرلیں۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ جامعۃ الفلاح کا قیام کچھ عظیم مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیمی ماحول کے ساتھ ساتھ تربیتی ماحول کا بھی خاص خیال رکھا جانا ضروری تھا۔ گرچہ دارالاقامہ کے لیے نگراں مقرر ہوتے تھے اور وہ تمام مقیم طلبہ کی تربیت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی اساتذہ تھے وہ اپنے درس وتدریس کے دوران تربیت کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ اس طرح سے اس وقت پورے جامعہ میں ایک بہترین تربیتی نظام قائم تھا۔ اساتذہ جنہوں نے ہماری تعلیم وتربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

طلبہ اور اساتذہ کے درمیان تعلق کس قدر مضبوط تھا اس کا انداز چند اہم واقعات سے کیا جاسکتا ہے؛

ایک مرتبہ ندوۃ العلماء سے نکالا ہوا ایک طالب علم جامعہ آیا۔ اس کا عالمیت کے درجات میں داخلہ ہوگیا۔ اس طالب علم کی شرارتیں کچھ ایسی تھیں کہ کچھ ہی دنوں میں جامعہ کے تمام ہی طلبہ اس سے ناراض ہوگئے اور تقریباً تمام ہی سینئر طلبہ نے طے کرلیا کہ اس کو جامعہ سے نکلوانا ہے۔ سینئر طلبہ کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں طے ہوا کہ پہلے اس کی پٹائی کی جائے اور پھر ذمہ داران سے درخواست کی جائے کہ اس کو فوری طور سے جامعہ سے نکال دیا جائے۔ پٹائی کا یہ سخت فیصلہ اس لیے لیا گیا تھا کہ اس طالب علم نے طلبہ کے

ساتھ بہت ہی بیہودہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق ایک گروہ کو بھیجا گیا کہ وہ جا کر اس کی پٹائی کرے جس میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا، اور سنجیدہ قسم کے طلبہ پر مشتمل ایک گروپ کو ذمہ داران کے پاس بھیجا گیا کہ وہ ذمہ داران سے درخواست کریں کہ اس کو فوراً جامعہ سے نکال دیا جائے، ورنہ جامعہ کا ماحول بہت زیادہ خراب ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں جبکہ یہ طلبہ ذمہ داران سے گفتگو کر رہے تھے انہیں یہ خبر پہنچی کہ کچھ طلبہ نے اس کی پٹائی کر دی ہے۔ اس پر ذمہ داران سخت نالاں ہوئے۔ قصہ مختصر یہ کہ دو ایک روز کے بعد تمام طلبہ کو ہال میں جمع کیا گیا، اور اساتذہ نے تمام دروازے اور راستے بند کر دیئے۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ ہمارے خلاف کوئی فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس واقعہ میں تمام ہی سینئر طلبہ شامل تھے اور سب نے یہ طے کیا تھا کہ معافی کسی حال میں نہیں مانگیں گے۔ چنانچہ فیصلے کی گھڑی آ گئی۔ سب سے پہلے ان طلبہ کو کھڑا کیا گیا جو پڑھنے میں سب سے اچھے تھے اور تقوی کے لحاظ سے نمایاں۔ ان سے کہا گیا کہ آپ نے غلطی کی ہے اس طالب علم سے معافی مانگئے ورنہ جامعہ سے آپ کا اخراج کیا جاتا ہے۔ ہم تمام طلبہ سکتے میں آ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔ خیر انہوں نے معافی مانگ لی۔ اس طرح باری باری سب کو کھڑا کیا جاتا رہا اور اس سے معافی مانگنے کے لیے کہا جاتا رہا۔ اس کے بعد اس طالب علم کا جامعہ سے اخراج کر دیا گیا۔ مزید یہ اعلان کیا گیا کہ اب جمعیۃ الطلبہ کی تمام سرگرمیاں بند کی جاتی ہیں۔

اس فیصلے سے طلبہ اور اساتذہ کے درمیاں ایک خلیج حائل ہوگئی۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ طلبہ اور اساتذہ میں بات چیت بالکل بند ہوگئی۔ بہت ہی عجیب منظر ہوتا تھا کہ اساتذہ کلاس میں تشریف لاتے اور خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ طلبہ ان سے کوئی بات چیت نہ کرتے اور نہ وہ پڑھانے کی کوشش کرتے۔ گھنٹہ پورا ہونے کے بعد یہ استاذ تشریف لے جاتے اور دوسرے استاذ تشریف لے آتے۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔ ظاہر ہے پہلے طلبہ و اساتذہ اتنے پیار و محبت سے رہتے تھے، اب اس طرح سے ایک دوسرے سے بات چیت نہ کرنا دونوں طرف محسوس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ہم سینئر طلبہ نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے۔ ہم لوگوں نے چند اساتذہ سے گفتگو کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اس سے ہمارے مشفق اساتذہ بہت خوش ہوئے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھی اپنے دل میں بہت تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ غالبًا کئی اساتذہ کے درمیان ہم نے اپنی گستاخی کا اعتراف کیا اور پھر ہم لوگ ویسے ہی رہنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اسی دوران ذمہ داران جامعہ نے ان تمام طلبہ کے گھر سرپرستوں کے نام خطوط روانہ کر دیے کہ

آپ کے بچے نے جامعہ کے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے، انہیں تنبیہ کی جائے کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ یہ خط ملتے ہی ہمارے والد صاحب اور ہمارے مرحوم بہنوئی صاحب جامعہ میں ہماری خبر لینے آ گئے۔ وہ سیدھے ناظم جامعہ کے پاس گئے۔ اس وقت ناظم جامعہ جناب مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب مرحوم تھے۔ والد صاحب نے بتایا کہ طیب کے سلسلے میں آپ کی یہ تحریر موصول ہوئی ہے، مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرا بیٹا یہاں دینی تعلیم حاصل کرنے پہنچا ہے اور غلط راستے پر جارہا ہے۔ مولانا نے یہ سنتے ہی کہا: نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے، طیب تو بہت اچھا لڑکا ہے اور میری خوب تعریف کی۔ اتنی بات ہونے کے بعد ہمارے پاس یہ پیغام آیا کہ ناظم جامعہ آپ کو یاد کررہے ہیں۔ میں حاضر ہوا اور اپنے والد صاحب اور بہنوئی صاحب کو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اچانک ان دونوں کی کیسے آمد ہوگئی۔ میں انہیں اپنے کمرے میں لے کر آیا، تب انہوں نے سارا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح جامعہ سے تمہارے بارے میں خط آیا تھا اور ہم دونوں تمہاری خبر لینے کے ارادے سے آئے تھے۔ مگر جب ناظم جامعہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تو تمہاری تعریف کے پل باندھ دیئے۔ یہ تھے ہمارے مشفق اساتذہ اور مربی۔

ہمارے وقت میں نمایاں اساتذہ میں سے تھے:

(۱) جناب مولانا شہباز ہندی صاحب مرحوم

(۲) جناب مولانا جلیل احسن ندوی صاحب مرحوم

(۳) جناب مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب مرحوم

(۴) جناب مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب مرحوم

(۵) جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب

(۶) جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب

(۷) جناب مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب

(۸) جناب مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحب

(۹) جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب

(۱۰) جناب مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب

(۱۱) جناب مولانا محمد عمران فلاحی صاحب

(۱۲) جناب مولانا نور محمد فلاحی صاحب مرحوم

(۱۳) جناب ماسٹر عبدالحمید صاحب بلریا گنج

(۱۴) جناب ماسٹر مسعود صاحب بلریا گنج

ہماری یہ تحریر ناقص اور نامکمل رہے گی اگر اپنے مخلص اور مشفق اساتذہ کرام کا کچھ تذکرہ نہ کر دیا جائے۔ اختصار کے ساتھ کچھ اساتذہ کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

.... جناب مولانا شہباز ہندی صاحب مرحوم ایک بہت ہی جید عالم دین تھے۔ جب ہم ثانوی درجات میں پڑھتے تھے تو مولانا اس وقت ہمارے نگراں ہوا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ ہوتا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے ہماری شرارت پہ پٹائی کی تو تھوڑی دیر کے بعد ہی بلا کر سمجھاتے اور اگر چوٹ زیادہ لگ گئی ہوتی تھی تو دوا بھی دیتے تھے۔

.... جناب مولانا جلیل احسن ندوی صاحب مرحوم مفسر قرآن اور عربی ادب کے ماہر تھے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے مولانا سے قرآن مجید اور عربی ادب کا علم حاصل کیا۔ قرآن پڑھانے کا ان کا انداز عجیب وغریب تھا۔ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن کے مفہوم کو کچھ اس طرح واضح کرتے کہ ہم طلبہ علمی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ بہت محظوظ بھی ہوتے۔ عربی ادب کے تو کیا کہنے۔ مولانا مرحوم کا انتقال اس وقت ہوا جب جامعہ میں تعطیل تھی۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کے سرہانے تفسیر کی کتاب تھی جو اس وقت ان کے زیر مطالعہ تھی۔ ساری زندگی قرآن مجید کے سائے میں گزری اور آخری وقت میں بھی قرآن کے ساتھ ہی اپنے مالک حقیقی کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم ان کی نماز جنازہ میں شریک ہو سکے۔ اللہ تعالی مولانا محترم کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

.... جناب مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب مرحوم فقہ اور حدیث کے استاذ تھے۔ نہایت متقی اور پرہیز گار اور ہم طلبہ سے بے انتہا محبت کرنے والے تھے، ان سے مل کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔

.... جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب ایک نہایت ہی ذہین اور باصلاحیت استاذ رہے ہیں۔ درس وتدریس کے دوران ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم طلبہ بحرالعلم کے پاس بیٹھے ہیں۔ نہایت مخلصانہ انداز میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔

.... جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب عربی ادب کے ماہر اور عربی زبان کو عربوں کے انداز میں بولنے پر عبور حاصل تھا۔ بہت ہی پیار ومحبت سے ہم طلبہ کو عربی زبان سکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ بہت مہمان نواز بھی تھے۔ قریب ہی کے گاؤں علاؤالدین پٹی کے رہنے والے تھے۔ اکثر شام میں گھر چلے جاتے تھے اور صبح جامعہ آتے تھے۔ ساتھ میں کھانے کی کوئی چیز لاتے تو ہمیں بھی دیا

کرتے تھے۔

...... جناب مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب ایک خاموش بحرالعلم کی مانند تھے۔ خاموشی ان کی خاص ادا تھی۔ جب بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ علم کی شعائیں بکھیر رہے ہیں۔

ان اساتذۂ کرام کا جن کا ہم نے اوپر بہت ہی مختصر انداز میں تذکرہ کیا ہے اگر ان کے بارے میں تفصیل سے لکھنا شروع کیا جائے تو ایک ایک استاذ کی شخصیت پر تفصیلی مضمون ہو جائے گا۔

ایک استاذ جن کا نام ابھی تک اس پوری تحریر میں کہیں نہیں آیا ہے ان کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ ہیں ماسٹر عبدالحکیم صاحب۔ موصوف نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ ہر وقت ذکر واذکار میں مصروف رہتے تھے۔ قرآن مجید سے خاص شغف تھا۔ زیادہ تر ان کا وقت قرآن مجید کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ نہایت مخلص، ہم لوگ درجہ فضیلت میں تھے تو وہ ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ قرأت کیوں نہیں سیکھتے۔ آپ کے یہاں قاری صاحب موجود ہیں۔ ان سے وقت لے کر آپ لوگ قرأت سیکھئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے قاری صاحب سے ایک وقت طے کرلیا۔ وہ ہم لوگوں کو اس وقت قرأت سکھانے لگے۔ ہم لوگوں میں ایک طالب علم ایسا تھا جس کی آواز کچھ اس طرح کی تھی کہ جیسے ہی وہ قرأت شروع کرتا ہم لوگوں کی بے تحاشہ ہنسی چھوٹ جاتی۔ ہفتہ دس دن کے بعد ماسٹر عبدالحکیم صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگوں کو قرأت سیکھتے ہوئے ہفتہ دس دن ہو گئے ہیں۔ اب تو آپ قرأت اچھی کرنے لگے ہوں گے، چنانچہ انہوں نے فرمائش کردی کہ آپ لوگ تجوید کے ساتھ قرآن سنایئے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم تمام طلبہ کا ذہن اس شخص کی طرف چلا گیا جس کا قرأت کا انداز بہت عجیب تھا اور ہم لوگوں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی، اور ہنسی بھی ایسی کہ وہ رکنے کا نام نہ لے۔ اب ماسٹر صاحب ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگے کہ جناب آپ لوگوں پر شیطان غالب آ گیا ہے۔ توبہ کیجیے۔ پر ہم لوگوں کی ہنسی نہ رکی۔ آخر میں ہم لوگ کمرے سے باہر آ گئے اور اپنی ہنسی پہ قابو پا کر دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی مانگی۔ وہ اتنے شفیق اور مہربان تھے کہ انہوں نے اس گستاخی کو معاف فرما دیا، ان کی اس نصیحت سے ہم لوگوں کو صحیح طور سے قرآن پڑھنا آ گیا۔ ایسے تھے ہمارے اساتذہ کرام جن سے ہم لوگوں نے استفادہ کیا اور یہ ان کی تعلیم وتربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم لوگ آج اس مقام پہ پہنچے ہیں کہ دین ودنیا کی رہنمائی کا کام کر رہے ہیں۔ یوں تو تحریر کرنے کو بہت کچھ ہے لیکن وقت کی تنگی اور دیگر وجوہات کی بنا پر مزید تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے۔

جامعہ کے ذمہ داران جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ہم لوگ یہ محسوس کرتے

تھے کہ جامعہ کے ہر ذمہ دار کو جامعہ کی ترقی کی بڑی فکر رہتی ہے۔ سب سے اہم بات جو میں نے جامعہ کے اساتذہ اور ذمہ داران میں دیکھی کہ اس وقت ان لوگوں میں کوئی آپسی اختلاف نہیں ہوا کرتا تھا۔ سارے اساتذہ شانہ بشانہ مل کر جامعہ کی تعمیر وترقی میں لگے ہوئے تھے۔

قصبہ بلریا گنج کے افراد جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی ہم لوگوں کو قصبے میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا وہاں کا ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ طلبہ ہمارے گھر آئیں۔ ہم ان کی کچھ خاطر مدارات کریں۔ جامعہ کی تعمیر میں بلریا گنج کے لوگوں کا بہت اہم حصہ ہے۔ حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم، جناب عیسی صاحب، جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جامعہ کی تعمیر وترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

جیسا کہ ہم تمام فارغین جامعہ اور متعلقین جامعہ جانتے ہیں کہ جامعہ کا نظام تعلیم بالکل جدید انداز کا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی آراستہ ہوتے تھے۔ اساتذہ کرام اور خود طلبہ یہ توقع رکھتے تھے کہ یہاں سے فارغ ہونے والا ہر طالب علم داعئ دین ہوگا۔ دین کو اس کی اصل شکل میں نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ آج اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن طلبہ قدیم کے پلیٹ فارم سے فلاحی برادران کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں اور ان کے پاس جو دین کا قیمتی اثاثہ ہے اس کو بروئے کار لانے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

جامعہ کئی پہلوؤں سے دیگر مدارس کے مقابلے میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، جامعہ کا نصاب تعلیم دیگر مدارس کے نصاب سے الگ ہے۔ جامعہ کا نصاب جدید وقدیم کا سنگم ہے۔ جامعہ میں قرآن کی تعلیم براہ راست قرآن کے ذریعہ دی جاتی ہے، جبکہ دیگر مدارس میں مخصوص تفاسیر کے ذریعہ قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

تحفظ شریعت

اور علماء کی ذمہ داریاں

□ ملت اسلامیہ کے درمیان علماء کی کیا اہمیت اور ان کا کیا مقام ہے؟

□ علماء کا یہ مقام اور منصب ملت اسلامیہ کے سلسلے میں ان سے کس رول کا تقاضا کرتا ہے؟

□ تحفظ شریعت کا مسئلہ ملت اسلامیہ ہند کا ایک اہم اور نازک مسئلہ بنتا جارہا ہے، اس ضمن میں علماء کا کیا رول رہا ہے اور کیا رول ہوسکتا ہے؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ''تحفظ شریعت اور علماء کی ذمہ داریاں'' سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔

(مدیر)

ابوالمکارم فلاحی ازهری،نئی دہلی۔موبائیل نمبر:09811441343

شریعت سے مراد اسلام کے قوانین ہیں جو قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس سے ماخوذ ہیں، یہ قوانین انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہیں۔قرآن پاک کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون"ترجمہ: بے شک ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔قرآن پاک کے علاوہ دیگر مصادر سے جو احکام ماخوذ ہیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ امت مسلمہ پر ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے حق کی شہادت کی ذمہ داری آپ ﷺ کی امت پر ڈالی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: "و كذلك جعلناكم أمة و سطا لتكونوا شهداء على الناس" یہ ذمہ داری عمومی طور پر تو پوری امت کی ہے لیکن خاص طور پر امت کے ان افراد کی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے نوازا ہے اور جنھوں نے اس کی توفیق سے شریعت کا علم حاصل کیا ہے اور اس کے مصادر سے اسلام کے قوانین کو سمجھا ہے کیونکہ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ علماء کس طرح اس ذمہ داری کو ادا کریں اور اس کے لیے کیا طریقے اختیار کریں؟ اس سلسلے میں میرے خیال میں علماء کی ذمہ داریاں تین نوعیت کی ہیں:

(۱) علماء کرام امت کے افراد کو اسلامی شریعت سے واقف کرائیں، خاص طور پر عائلی قوانین یا مسلم پرسنل لاز کے سلسلے میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کریں۔عموماً دیکھا جاتا ہے کہ ناواقفیت کی بنا پر نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل میں مسلمان شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۲) غیر مسلموں میں اسلام اور اس کے قوانین کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ علماء کرام غیر مسلموں میں وسیع پیمانے پر اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کا تعارف کرانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے مسلکی اور جماعتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر مشترک طور پر مہم چلائی جائے۔اس سلسلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ذریعہ کافی کام کیا جاسکتا ہے، مختلف زبانوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے قوانین پر مشتمل پمفلٹ شائع کیے جائیں، مختلف موضوعات پر سمینار اور کانفرنسیں منعقد کی جائیں جن میں غیر مسلموں کو خاص طور پر مدعو کیا جائے اور ان کے سامنے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قوانین کو واضح انداز میں پیش کیا جائے، اسلامی شریعت سے متعلق ان کے ذہنوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کے مناسب اور مدلل جوابات دیئے جائیں۔اس طرح امید ہے کہ ان کی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور یہ تحفظ شریعت کے سلسلے میں ایک اچھا

کام ہوگا۔

(۳) اسلام اور اس کی شریعت کے سلسلہ میں مختلف فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے جو چیلنجز پیش کیے جا رہے ہیں انھیں قبول کیا جائے اور صحیح دلائل کے ذریعہ حکمت کے ساتھ ان کے جوابات دیے جائیں۔

امید ہے کہ ان طریقوں پر عمل کر کے علماء کرام تحفظ شریعت کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے کسی حد تک سبکدوش ہو سکیں گے۔ واللہ ولی التوفیق۔

عبدالحق فلاحی، نئی دہلی، موبائیل نمبر:09899622150

ہندوستان میں مغلیہ دور میں اسلامی قانون ہی ملکی قانون (Law of Land) تھا، جو انگریزوں کی ہندوستان میں آمد تک حسب معمول اپنا کام کرتا رہا۔ سول قانون اور فوجداری قانون دونوں ہی اسلام کے تھے اور ان کے مطابق عدالتی فیصلے ہو رہے تھے۔ یہاں کی غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہبی اور رواجی قانون کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی تھی۔ ۱۷۶۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد کچھ عرصہ تک انگریز جج اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ انگریزی قانون نافذ ہوتا چلا گیا اور انجام کار ۱۸۶۲ء میں اسلامی فوجداری قانون ختم کر کے انڈین پینل کوڈ (Indian Panel Code) نافذ کر دیا گیا جو آج بھی اسی نام سے رائج ہے۔ البتہ نکاح، طلاق، وراثت، ہبہ وغیرہ عائلی اور شخصی امور کی حد تک اسلامی قانون کو باقی رہنے دیا گیا۔ آگے چل کر یہاں کی غیر مسلم آبادی کی تہذیب کے زیر اثر بعض مسلم برادریوں میں ہندوانہ رسم ورواج اور قانون داخل ہو گئے۔ مثلاً جائیداد میں وراثت سے لڑکیوں کی محرومی نے ایک عمومی صورت اختیار کر لی جو آج بھی عوام وخواص میں بدستور برقرار ہے۔ اس معاملے میں عامی اور عالم کا بھی کوئی فرق نہیں رہا۔ دینی مدارس کی کثرت، دینی اجتماعات اور جلسوں میں لاکھوں افراد کی شرکت، کئی کئی بار نفلی حج کی ادائیگی کے باوجود حق وراثت سے لڑکیوں کی محرومی ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ اس کے برعکس لڑکیوں کے سرپرستوں کے ذریعہ منگنی، مہندی، تلک اور شادی میں رخصتی کے بعد کئی مرحلوں میں انجام دیئے جانے والے رسوم ورواج کو نبھانے میں لڑکیوں کے سرپرست لٹ جاتے ہیں اور قرضوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ اسی طرح بعد از مرگ دیگوں کی کھنک اور خوشبو کے ساتھ قرآن خوانی، تیجا، چھٹھ، برسی اور برتھ ڈے کی تقریبات نے بھی ہمارے مسلم سماج پر اپنا سایہ ڈال رکھا ہے جو ہم سایہ قوم

کے زیر اثر پھل پھول اور پنپ رہا ہے۔ اہل کتاب کے فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے، ان کے روحانی پیشواؤں نے زہد و ورع کے مبالغوں سے اور ان کے جاہل اور کم فہم عوام نے اپنی وہم پرستی اور خود ساختہ آداب و ضوابط سے سماج کو بری طرح بوجھل کر رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شبانہ روز جدوجہد سے ان بیڑیوں کو کاٹ پھینکا جس کی طرف قرآن میں واضح طور پر اشارہ ملتا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (سورہ اعراف:۱۵۷)

اس وقت مسلمانان ہند کے لیے تحفظ شریعت کا مسئلہ ایک چیلنج کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ سردست طلاق ثلاثہ کی آڑ میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی فضا تیار کی جا رہی ہے اور قانونی داؤ پیچ کے اوزار اور ہتھیار تیار کیے جا رہے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ دستور ہند کے رہنما اصولوں میں سے ایک دفعہ ۴۴ ہے جو سارے ہندوستانی شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی سفارش کرتی ہے وہیں دوسری طرف سب سے اہم آئینی دفعہ ۲۵ ہے جس کے تحت دستور نے امن عامہ، صحت، اخلاق اور دیگر شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے تمام شہری اور غیر شہری لوگوں کو یکساں طور پر آزادئ ضمیر اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کا حق دیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ امر واضح ہے کہ بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ کو رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ پر برتری حاصل ہے۔ بہر کیف، موجودہ حکومت ایک ملک ایک قوم اور ایک تہذیب کے فسطائی نظریہ کی بنیاد پر اپنا ایجنڈا یونیفارم سول کوڈ کی صورت میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔

ماضی میں بھی اس طرح کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں بھوپال کی شاہ بانو نے گزارہ بھتہ مطلقہ کے لیے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے بھانومتی کا پٹارہ کھول دیا تھا جو مسلم مہیلا مطلقہ قانون کی صورت میں برآمد ہوا۔ ابھی حال میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کی ذاتی رائے کے سامنے آ جانے کے بعد یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے تعلق سے آوازیں اٹھائی جانے لگیں اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کورٹ نے فیصلہ دے دیا ہو۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہمارے وکلاء اور جج صاحبان بھی مسلمانوں کے عائلی قوانین کی ان تفصیلات سے واقف نہیں ہیں جو فی الواقع اسلامی قوانین کا حصہ ہیں اور اس عدم واقفیت کی وجہ سے غلط سلط فیصلے آتے رہتے ہیں۔ جسٹس کرشنا ایر نے طلاق کے ایک مقدمہ کے دوران اسلام کے عائلی قوانین کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تو انھیں یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ اسلام کا قانون طلاق حیرت انگیز طور پر معقولیت، حقیقت پسندی اور جدت لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اس وقت اپنے فیصلے میں لکھا کہ ''اس بات کی حقیقت غلط العوام سے زیادہ نہیں کہ مسلمان مرد کو قرآن نے طلاق کے لامحدود

اختیارات دے رکھے ہیں۔اس کے برخلاف قرآن طلاق دینے کی خاطر بہانے تلاش کرنے سے روکتا ہے اور بیوی کو بلاوجہ چھوڑ دینے یا اسے لٹکائے رکھنے کو غضب خداوندی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ (البقرۃ:۲۳۲،النساء:۱۹)خلع کے تعلق سے جسٹس ایئرقرآن کی اس آیت کو کہ جس طرح شوہروں کو اپنی بیویوں پر اختیارات حاصل ہیں اسی طرح بیویوں کو بھی اپنے شوہروں پر اختیار حاصل ہے،ایک انقلابی حکم بتاتے ہیں جس کی رو سے عورتیں مردوں کے مساوی ہو جاتی ہیں۔(روز نامہ انقلاب نئی دہلی،خالد شیخ کا خصوصی مضمون)

سورہ البقرہ کی متعلقہ آیت یہ ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرۃ:۲۲۸)لیکن مساوات مرد وزن کے نعرے کے جوش میں جج صاحب اس آیت کے آخری فقرہ کو ملحوظ نہیں رکھ سکے جس میں دوطرفہ حقوق کا ذکر کیے جانے کے بعد "وللرجال علیھن درجة" کی صراحت بھی موجود ہے کہ عورتوں پر مردوں کو یک گونہ فوقیت حاصل ہے۔)

بہر کیف اطلاع کے مطابق پچھلے دنوں مرکزی وزراء کے گروپ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں سپریم کورٹ میں داخل کیے جانے والے جواب کے متن پر غور کیا گیا ہے جس میں وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ، وزیر خزانہ ارون جیٹلی اور وزیر دفاع منوہر پاریکر اور وزیر برائے ترقی خواتین و اطفال مینکا گاندھی وغیرہ کی موجودگی میں طلاق ثلاثہ کو کالعدم قرار دینے سے متعلق عرضی گزار مسلم خواتین کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

کسی بھی صاحب نظر سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لاء کو کس سمت لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے اور یہ امر بھی مخفی نہیں ہے کہ نام نہاد پروگریسیو خواتین کے گروپ کس کی ایماء پر تشکیل دیئے جاتے ہیں اوران کی فنڈنگ کون کرتا ہے۔اسی طرح کی شخصیات میں ایک مختار عباس نقوی ہیں جو ۹۰ء کی دہائی میں بابری مسجد اشوپر سنگھ پریوار سے جڑے رہے اور مسلم مخالف بیانات دیتے دیتے آر ایس ایس کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور اب اقلیتی شعبہ کے مرکزی وزیر(آزاد انچارج) کے منصب پر فائز ہیں۔

حکومت کے کارپرداز اسلامی عائلی قوانین کو سبوتاژ کرنے کے لیے جو جال تیار کر رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہے۔سوال یہ ہے کہ مسلم علماء پر اس سلسلہ میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔اس وقت طلاق ثلاثہ کا مسئلہ ایک سنگین صورت حال اختیار کر گیا ہے،احکام شریعت سے عام مسلمانوں کی بے خبری اور ناواقفیت بڑی وجہ ہے جس کو بہانہ بنا کر پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔حد یہ ہے کہ جب ایک مسلمان خانگی نااتفاقی اور ناچاقی کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے وکیل

کی خدمات حاصل کرتا ہے تو وہ مہاشے بھی ۳ طلاق کا مضمون تحریر فرماتے ہیں کیونکہ انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ نکاح کا معاہدہ ایک طلاق سے بھی فسخ یا کالعدم ہوسکتا ہے۔ان ظالموں کو یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ ہوسکتا ہے کہ اس جوڑے میں آگے چل کر موافقت اور صلح صفائی کا خیال آجائے اور وہ دوبارہ اپنی ازدواجی زندگی بحال کرلیں جبکہ خود قرآن میں رجوع کرنے کا حکم صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

ان حالات میں علماء کرام کی خدمت میں چند معروضات پیش خدمت ہیں:

(۱) خطبۂ نکاح پڑھنے کے بعد نکاح وطلاق کے متعلق کچھ بنیادی احکام ومسائل حاضرین مجلس کے سامنے بیان کردیئے جائیں۔ایک قاضی نکاح کو بسااوقات کئی جگہوں پر ایک ہی شب میں کئی کئی نکاح پڑھانے ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ بڑی عجلت میں خطبہ پڑھ کر ایجاب وقبول کی رسم ادا کر کے اپنی فیس لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ایسی صورت میں یا تو انھیں پابند کیا جائے کہ خطبۂ کا نکاح کا ترجمہ وتشریح لازماً کریں اور نکاح وطلاق سے متعلق کچھ ضروری مسائل سے حاضرین کو آگاہ کریں، بصورت دیگر کسی دوسرے معتبر اور مستند عالم سے اس موضوع پر مختصراً اظہار خیال کرنے کا پیشگی انتظام کیا جائے کیونکہ بہت سے قاضی صاحبان کو اظہار خیال پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، ایسے میں اگر وہ کچھ بولیں بھی تو حاضرین کو اس کا کچھ خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔

(۲) ہر شہر اور قصبے میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کے مشورے سے ہر مہینے کے خطبات جمعہ کے موضوعات کا تعین کیا جائے اور اس میں عائلی قوانین، نکاح وطلاق، خلع، ہبہ، میراث وغیرہ کے مسائل سلسلہ وار بیان کیے جائیں۔حاضرین کی رعایت سے اگر ان مسائل میں جزوی اختلاف ہوتو اسے بھی بیان کردیا جائے۔

(۳) شہر اور قصبے کی لائبریریوں، محلّہ سدھار کمیٹیوں، مقامی این جی اوز (NGOs) کی طرف سے وقفے وقفے سے شرعی مسائل سے آگاہی فراہم کرنے اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے گلی محلے اور اطراف کے لوگوں کو جمع کر کے اپنے موضوع پر تیار لوگوں کو اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔

(۴) مساجد میں بالعموم نماز بعد صبح شام قرآن کا ترجمہ، کوئی حدیث کی کتاب یا دینی موضوعات پر کتابیں پڑھنے کا چلن ہے۔مسلم پرسنل لا بورد کی طرف سے عائلی قوانین پر جو چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کیے گئے ہیں، انھیں بھی پڑھ کر سنانے کا موقع نکالا جائے خواہ وہ ہفتے میں دو ہی دن ہو۔اسی طرح مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی اور دیگر اشاعتی اداروں نے بھی مسلم پرسنل لا اور اسلامی خاندان پر کتابچے شائع کیے ہیں، ان سے بھرپور استفادے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(۵) شہروں اور قصبات میں مسلم اداروں، تنظیموں اور جماعتوں نیز عوام کی طرف سے وقفے وقفے سے ایسے سمینار اور سمپوزیم منعقد کیے جائیں جن مین نکاح، طلاق اور وراثت، ہبہ وغیرہ متعلقہ تمام مسائل پر قانونی ماہرین اور موضوع پر آ گاہی اور بصیرت رکھنے والے علماء کرام کو اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔ سماجی خدمت کے کاموں سے وابستہ سوشل ورکرس کی خدمات بطور خاص حاصل کی جائیں جو یہ کام رضا کارانہ خدمت کے جذبہ سے انجام دیں۔

(٦) مدرسوں، اسکولوں، کالجوں میں پرسنل لا کے مختلف پہلوؤں پر مباحثہ، مذاکرہ اور ڈبیٹ منعقد کیے جائیں اور سیر حاصل گفتگو کرنے والوں کی انعام واکرام کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۷) علماء کرام سے مسلم عوام بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ شرعی مسائل میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ وہ بذات خود تحفظ شریعت کے عملی نمونے قائم کریں۔ ازدواجی تعلقات کی خوشگواری، وراثت میں بہنوں کا حق اور حصہ دینا، شادی بیاہ میں بارات اور گھوڑے جوڑے سے اجتناب، کفایت شعاری کے ساتھ شادی، عقیقہ، ولیمہ کی تقریبات کی انجام دہی۔ گلی، محلے اور گاؤں کے نزاعی معاملات خواہ وہ نکاح وطلاق کے مسائل ہوں یا زمین جائیداد کے دیگر سماجی مسائل ہوں۔ ان معاملات کے تصفیہ اور مصالحت میں سوجھ بوجھ رکھنے والے تجربہ کار علماء کی پیش قدمی تحفظ شریعت کی راہ کا سنگ میل ثابت ہوسکتی ہے۔

(۸) کوئی بھی سنجیدہ خداترس عالم اپنے لڑکوں کی شادی میں بھاری بھرکم جہیز یا کیش کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ لینے اور مانگنے کے بھی طریقے ہوتے ہیں، اپنے علاقہ کے ایک نہایت سنجیدہ اور بزرگ عالم دین کے بارے میں مجھے چند سال قبل یہ معلوم ہوا کہ لڑکی والے انھیں لالچ دیتے گئے اور اس چکر میں انھوں نے کئی بار خوب سے خوب تر کی تلاش میں پالا بدلا۔ اللہ رحم فرمائے۔ کبھی یہ کہنا کہ ابھی لڑکے کی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے، کبھی یہ بہانہ کہ لڑکا نہیں کرنا چاہتا ہے، کبھی یہ حیلہ بہانہ کہ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے، میں تو سیدھے سادے سنت طریقہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر لڑکے کی کچھ ڈیمانڈ ہے آپ دیکھ لیجئے۔

(۹) وقت آ گیا ہے کہ ہم عقل کے ناخن لیں اور لولے لنگڑے عذرات کو ایک کنارے کر کے شادی کو آسان بنائیں اور اپنے اعزہ واقرباء کے علاوہ مسلم سماج اپنے طرز عمل سے یہ پیغام دے کہ کم خرچ میں اچھی اور معیاری شادی ہوسکتی ہے۔ اس سے رسول اللہ کی سنت زندہ کرنے اور اس کا ثواب حاصل کرنے کا موقعہ تو ملے گا ہی لیکن اس سے آگے بڑھ کر دعوتی نقطۂ نظر سے بھی اس کا ثواب ہے۔

جس تکثیری سماج کا ہم حصہ ہیں اس میں ہمیں داعی الی اللہ اور امتِ وسط کا رول ادا کرنا ہے۔ غیر مسلموں پر بھی ہمارے اس طرز عمل کا غیر شعوری اثر پڑے گا جب وہ یہ دیکھیں گے کہ بغیر کسی خاص تام جھام کے، بغیر مقروض ہوئے بھی شادی کی جا سکتی ہے۔

(۱۰) شادی بیاہ کے ذیل میں علماء کرام سے یہ کہنے کا بھی جی چاہتا ہے کہ نقد مہر کی ادائیگی کا چلن عام کریں۔ وہ نکاح پڑھاتے وقت یہ ترغیب بھی دے سکتے ہیں کہ حسب حیثیت مہر کی نقد ادائیگی کریں خواہ وہ سونے چاندی کی شکل میں ہو یا نقد کی شکل میں۔ ایک آسان اور سیدھا سادہ طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکے والے خود پیشکش کریں کہ وہ ایک ماہ کی یا دو ماہ کی تنخواہ مہر میں نقد ادا کر رہے ہیں۔ ایک بڑی عجیب وغریب صورت حال ہمارے سماج میں یہ ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی والے اس خیال سے بھاری بھر کم مہر مقرر کرواتے ہیں تا کہ ہونے والا داماد اس لڑکی کو کبھی طلاق دینے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے اور عملاً ہوتا یہ ہے کہ وہ مہر مؤجل (ادھار مہر) زندگی بھر مہر مؤجل ہی رہ جاتا ہے۔ اگر بیوی کے سامنے شوہر کا انتقال ہوتا ہے تو وہ مہر معاف کرا لیتا ہے اور جو زیادہ چالاک ہوتے ہیں وہ شب عروسی میں ہی دلہن کو ہاتھ لگانے سے پہلے مہر معاف کرا لیتے ہیں۔ جو لڑکی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر سسرال آ گئی ہے کیا اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ مہر کی نقد ادائیگی پر اصرار کرے، چاہے وہ پچاس فیصد ہی نقد ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو، ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اگر نقد مہر ادائیگی کی شرط لگے گی تو اس کا اندیشہ ہے کہ نکاح ہی نہیں ہو پائے گا کیونکہ ہم نے خاموش رہ کر یا بے عمل رہ کر سماج کو یہی پیغام دیا ہے کہ مہر طے کر لو، کون دیتا دلاتا ہے۔ اس صورت حال کا یہ اثر ہے کہ اگر عام معاشرے میں کوئی شوہر نیک نیتی سے بیوی کو مہر ادا کرنے کی بات کرتا ہے تو بیوی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے کہ شاید میاں کا ارادہ بدل گیا ہو، مجھ سے چھٹکارا لینا چاہتے ہوں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ دو خدا ترس گھرانوں کے درمیان رشتہ طے ہوا۔ بزرگ عالم دین والد نے اپنی بچی کا نکاح خود پڑھایا اور اسی مجلس میں لڑکے کے باپ نے مہر کی رقم کا لفافہ پیش کر دیا۔

(۱۱) ایک خراب صورت حال یہ بھی ہے کہ مہر تو مؤجل (ادھار مہر) میں چلی گئی اور دلہن کو زیور تحفہ، ہدیہ تصور کر کے دیا کہ جب ضرورت ہوگی اسے واپس بھی لے سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جب میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو کسی نہ کسی بہانے سے زیور مانگ لیا اور موقع پا کر طلاق دے دی، اسی لیے ہوشیار عورتیں سسرال سے ملا زیور اپنے مائیکے میں رکھتی ہیں۔ لیکن یہ تا کَے؟

(۱۲) علماء اور دانشوروں کے باہم مل کر کرنے کا ایک کام یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضلعی عدالتوں (سیشن کورٹ) سے لے کر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی بار ایسوسی ایشن سے ربط قائم کر کے بار ایسوسی

ایشن کے تعاون سے پرسنل لاء پر مذاکرہ منعقد کرائیں اور اس میں بشمول پرسنل لا بورڈ کے مقامی اور مرکزی ذمہ داروں کو مدعو کرنے کے، وکیلوں، ججوں، صحافیوں، کالجوں، یونیوسٹیوں کے ٹیچروں اور سماج کے سر برآوردہ لوگوں کو مدعو کر کے ان کے شکوک وشبہات اور اعتراضات بھی سنے جائیں اور اس میں ان کے سوالوں کے جواب کے علاوہ عائلی قوانین کے ان پہلوؤں پر بطور خاص روشنی ڈالی جائے جو ان کی نظر سے اوجھل ہیں۔ غیر مسلموں کے نزدیک مسلمانوں کا پردہ اور تعدد ازدواج بھی قابل اعتراض چیزیں ہیں۔ پورے ملک کے اعداد شمار کی روشنی میں ان سب چیزوں کی وضاحت ہونی چاہیے کہ کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے، پردے کے فائدے کیا ہیں اور بے پردگی اور عریانیت کے کیا نقصانات سماج پر مرتب ہو رہے ہیں۔ تعدد ازدواج کے اعداد وشمار کی روشنی میں حقائق کا اظہار کرنا چاہیے۔ فیملی پلاننگ پر عمل نہ کرنے اور زیادہ اولاد پیدا کرنے کے تعلق سے بھی مسلمانوں کو ہدف تنقید بنایا جاتا رہتا ہے، ان سبھی پہلوؤں پر مجالس مذاکرہ اور سمینار منعقد کیے جاتے رہنے چاہئیں۔

(۱۳) دینی مدارس کے سربراہوں کی خدمت میں یہ تجویز پیش کرنے کا جی چاہتا ہے کہ وہ فضیلت یا تخصص کے کورس میں مسلم پرسنل لا پر تحقیقی مقالے لکھوائیں اور موضوعات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرایا جائے، اس کے لیے مطلوبہ مواد انھیں فراہم کرایا جائے۔ طلبہ کے اندر انگریزی کی اچھی استعداد پیدا کی جائے جو ان کے کام میں معاون ہو۔ باقاعدگی سے میری مراد یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے تحت آنے والے تمام مسائل ومعاملات کا قانونی انداز میں مطالعہ کرایا جائے اور ملک کی عدالتوں میں زیر بحث پرسنل لاء کے مسائل اور مخصوص Cases کا تفصیلی ریکارڈ حاصل کر کے مطالعہ کرایا جائے۔ طلبہ کے سامنے مسلم پرسنل لاء سے متعلق فیصلوں کی نظیر ہوں، انھیں مسلم پرسنل لاء کی عدالتی تاریخ سے بھی کما حقہ واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ متعلقہ ریاست کی ہائی کورٹ میں مسلم پرسنل لاء سے متعلق کیسیز کا بطور خاص ریکارڈ حاصل کر کے ان کا مطالعہ کرایا جائے۔ مطالعہ وتحقیق میں طلبہ کی مدد اور رہنمائی کے لیے اچھے انگریزی داں اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔

(۱۴) آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں اور مؤقر ممبران سے گزارش ہے کہ وہ بورڈ کی طرف سے ایسی کتاب مرتب کروائیں جس میں ملک کی دیگر اقلیتوں کے پرسنل لاء کا تقابلی مطالعہ ہو۔ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں عیسائیوں، پارسیوں، سکھوں اور جینیوں کے پرسنل لاز کیا ہیں۔ ان کی کیا خصوصیات ہیں اور کیا ان سبھی اقلیات کے لیے یکساں سول کوڈ بنانا عملاً ممکن ہے؟

پروفیسر محمد اسحاق،شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ای میل:
mishaque@jmi.ac.in،موبائل نمبر:09891922635

اللہ پرودگار عالم نے انسانوں کو عقل سلیم، خیر وشر کی پہچان اور عہد ربوبیت کی نعمتوں سے آراستہ کر کے پیدا کیا۔اسی کے ساتھ نبوت ورسالت کا بھی پورا اہتمام کیا۔ان پیغمبروں کے ساتھ کتابیں بھی نازل کیں تا کہ ہدایت کے معاملے میں انسانوں کو کوئی ابہام باقی نہ رہے۔سب سے آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اوران کے ساتھ اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید نازل ہوئی جو رہتی دنیا تک کے لیے اب ہدایت کی کسوٹی اور حق کی آخری حجت ہے۔اللہ نے اس کتاب ہدایت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔اس کے علاوہ پیغمبر کی سنت بھی صحابہ کرام کے عملی اجماع اور تواتر سے محفوظ ہوگئی۔ احادیث کے بڑے ذخیرہ میں اس دین کی شرح ووضاحت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا اسوہ حسنہ موجود ہے۔محدثین نے اس قیمتی سرمایہ سے استفادہ کے لیے نہایت وقیع خدمات انجام دی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں۔وہ نبی اور رسول تھے،ان کے ذریعہ اللہ تعالی نے انسانوں کے لیے اپنی آخری ہدایت نازل کی ،انھوں نے اس ہدایت کے قبول کرنے والوں کو کامیابی ،نجات اور ابدی فلاح کی خوشخبری دی اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو انجام بد سے ڈرایا۔مدینہ ہجرت کرنے کے بعد خدا نے انہیں ایک ریاست کا حکمراں بنایا،اس حیثیت سے انہوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں، عدالتی فیصلے کیے، صلح وجنگ کے امور طے کیے، ریاست کے داخلی اور خارجی مسائل حل کیے۔آپ کی وفات کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اسے خلافت علی منہاج النبوت اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ حکومت نبوی اسوہ اور طریقہ کے مطابق قائم ہوئی۔آپ اس دین کے آئیڈیل اور مثالی عالم بھی تھے بلکہ عالموں کے ایسے امام اور رہنما تھے جن کا علم خطا اور نسیان سے پاک اور عصمت کا حامل تھا۔آپ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد امت مسلمہ کو اس دین کی امانت سپرد ہوئی اور علماء اس دین کے عالم قرار پائے۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کے ساتھ وفاداری کے اپنے عہد پر قائم رہے قرآن مجید جو حبل اللہ المتین ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہے۔واضح رہے کہ اللہ کا دین صرف وہی ہے جس کی سند پیغمبر سے ثابت ہے۔پیغمبر کی ذات والا صفات کے علاوہ کوئی نہیں جو اللہ کے دین میں اس کی ہدایت کے مطابق کمی یا بیشی کرے۔یہی وہ دین حق ہے کہ جس کے دین ہونے میں امت کے اندر بھی کوئی اختلاف نہیں اور انسانیت کا اجتماعی ضمیر بھی اس دین حق کے بارے میں اختلاف اور اعتراض کی کوئی

گنجائش نہیں رکھتا۔ البتہ اس دین کے علاوہ تاریخی عمل کے نتیجے میں جو باتیں دین میں شامل ہوگئی ہیں چونکہ وہ انسانی استنباطات ہیں اور عام انسانوں کا علم خطا اور نقص سے پاک نہیں ہوتا اس کے علاوہ ان کی تحقیقات کا اطلاق ہر عہد کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قدیم تحقیقات و تفہیمات پر غور و فکر اور نظر ثانی کا عمل جاری رہے۔ اور یہ کام امت کے ہر فرد کا نہیں ہے اس کام کے لیے ضروری ہے کہ امت کے باشعور، حساس، ذہین اور مخلص لوگوں کا ایک گروہ دین میں گہری بصیرت پیدا کرے اور امت کی علمی روایت کا جائزہ لے اور اس دین کی دعوت کو علم و استدلال کے ساتھ عام کرے جس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دین اور شریعت دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ ظہور احمد اظہر نے اردو دائرہ معارف اسلامی میں شامل اپنے مقالہ بعنوان شریعت میں لفظ شریعت کو دین اسلام کے لیے ایک مترادف اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''شریعت کے معنی وہ امور ہیں جو زمین اور اہل زمین سے تعلق رکھتے ہیں، اسی مناسبت سے شارع یا شارعہ (جمع شوارع) ایسے راستے کو کہتے ہیں جو سیدھا اور محفوظ ہو۔ اسی مناسبت سے شریعت بھی ایک محفوظ اور سیدھا راستہ ہے جو بھلائی اور نیکی پر منتج ہوتا ہے۔۔۔۔ لفظ شریعت یا شریعت اسلامیہ جب دنیا کے مروج قوانین کے مقابلے میں مستعمل ہو تو اس سے مراد وہ تمام احکام ہوتے ہیں جن پر دین اسلام مشتمل ہے اور جو فقہ اسلامی کے مآخذ اربعہ، یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس کی بنیاد پر قائم و مشتمل ہیں۔ (ملاحظہ ہو: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور جلد 11 صفحات 703 تا 706) شریعت کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ یہ ایک ''جامع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کی رسول اللہ نے تعلیم دی ہے۔ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے وہ سب کا سب شریعت ہے۔ پورا قرآن مجید اور پوری سنت کے مجموعے کا نام شریعت ہے۔ اس شریعت میں انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کی کامیابیوں کے لیے جن جن ہدایات اور جس جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ ساری رہنمائی اور ہدایت کا سامان اس شریعت میں موجود ہے۔'' (محاضرات فقہ 31 تا 32) لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دین اور شریعت دو الگ الگ اصطلاحات ہیں ان کے معانی میں بھی اختلاف ہے۔ سورہ شوری کی آیت 13 میں لفظ دین سے مراد وہ دین ہے جو ہر پیغمبر کے یہاں مشترک تھا، جس میں زمانہ کے تفاوت کی وجہ سے شرائع میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ''اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی

وحی اب ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم اور موسی اور عیسی کو فرمائی، اس تاکید کے ساتھ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو'۔ اسی کے ساتھ دین وسیع مفہوم میں دین اسلام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے چونکہ شرائع میں اختلاف رہا ہے تو اسی وضاحت کرتے ہوئے سورہ مائدہ آیت 48 میں ارشاد ہوا لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا یعنی ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت یعنی ایک لائحہ عمل مقرر کیا ہے۔ اس آیت کا پس منظر یہ واضح کرتا ہے کہ اہل کتاب نے خدا کی شریعت کے ساتھ غفلت و اعراض کا رویہ اختیار کیا۔ انہیں چاہیے تھا اللہ کی شریعت کو اللہ کا حکم یعنی فیصلہ سمجھتے ہوئے دل کی پوری یکسوئی سے اختیار کرتے۔ اللہ کے قانون کو چھوڑ کر اس کے مقابلے میں دوسرے قانون کو اختیار کرنا کفر، ظلم اور فسق ہے۔ سورہ جمعہ اور قرآن کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا ایک حصہ ایمانیات و اخلاقیات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ قانون وشریعت کہلاتا ہے۔ قرآن نے ایک کو الحکمۃ اور دوسرے کو الکتاب قرار دیا۔ اول الذکر کے تحت ایمانیات و اخلاقیات کے مباحث آتے ہیں اور موخر الذکر کے تحت قانون وشریعت۔

شریعت کے لفظ کو خواہ دین کا مترادف قرار دیا جائے یا صرف قانون اور احکام الٰہی کے مفہوم میں لیا جائے تحفظ شریعت کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے شریعت کو مذہبی انتہا پسندی، تشدد، مذہبی گروہ بندی اور شریعت سازی سے بچایا جائے۔ ایسا اس لیے کہ دین کے حوالہ سے اگر کوئی بات کہی جائے لیکن اس کی بنیاد قرآن وسنت میں نہ ہو تو یہ تو افتراء علی اللہ ہے اور یہ بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

تحفظ شریعت کے حوالے سے دینی حلقوں میں جو باتیں کہی جاتی ہیں اس سلسلے میں غور کرنا چاہیے کہ کیا ہمارا دین اس سلسلہ میں ہم سے کچھ مطالبہ بھی کرتا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے اس کا جواب ہمارا دین ہمیں یہ دیتا ہے کہ جس خالق نے انسان کی خلقت کا اہتمام کیا اس نے اس کی ہدایت کا بھی پورا اہتمام کیا (الذی خلق فسوی و الذی قدّر فهدی). اور قرآن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالی نے تکمیل دین کے ساتھ اتمام حجت کا بھی پورا اہتمام کیا اس سلسلے میں اطمینان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے قرآن میں وعدہ کیا ہے کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون ۔

اس آیت کے تحت صاحب تدبر قرآن نے لکھا ہے کہ ''تم پر ذمہ داری صرف تبلیغ ودعوت کی ہے، تم اس کو ادا کر دو۔ رہا اس کتاب کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا مسئلہ تو یہاں ہم سے متعلق ہے، اس کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا انتظام ہم کریں گے۔ اللہ تعالی نے یہ وعدہ کن کن شکلوں میں پورا

فرمایا، تاریخ میں اس سوال کا پورا جواب موجود ہے۔'' صاحب تفہیم القرآن اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں ''یہ براہ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمہارے مٹائے مٹ سکے گا، نہ تمہارے دبائے دب سکے گا، نہ تمہارے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ تمہارے روکے اس کی دعوت رک سکے گی، نہ اس میں تحریف اور ردوبدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکے گا۔''

عام طور پر ہمارے روایتی حلقوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ فقہ اسلامی قرآن وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ الآمدی اور حسن محمد الخطیب جیسے اہل علم کے نزدیک شریعت اور فقہ مترادف اور ہم معنی ہیں۔ لیکن راقم کے نزدیک فقہ اور شریعت دونوں کا ماخذ جب ایک نہیں دو ہیں تو دونوں کو ایک کہنے کی غلطی کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اول الذکر کا ماخذ انسان اور اس کا فہم ہے اور ثانی الذکر وحی الٰہی کی روشنی ہے۔ شریعت کو سمجھنے اس پر غور وفکر اور استنباط کرنے کی جو خدمات ہمارے فقہاء نے انجام دی ہیں وہ شریعت نہیں بلکہ شریعت کا فہم کہلائے گا اور ہر وہ چیز جو قیمتی اور مفید ہو، انسانیت کے لیے کارآمد ہو انسانیت کا مشترکہ علمی ورثہ قرار پائے گی۔ شریعت پر علمی تنقید کسی صاحب ایمان کے لیے جائز نہ ہوگی جبکہ شریعت کے فہم اور فقہاء کی آراء پر ہمیشہ تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور علمی رویہ کی ہمیشہ تحسین کی گئی ہے۔

علماء دین کا مقام ومرتبہ کسی عام عالم جیسا نہیں ہے۔ انہیں ختم نبوت کے بعد انبیاء ورسل کے علوم کا نائب اور وارث مقرر کیا گیا ہے۔ ان کو جس دین کے فہم اور اس کی دعوت کی نازک ذمہ داری سونپی گئی ہے اسے ذیل کی تمثیل سے سمجھا جا سکتا ہے۔

''راوی صادق البیان کہتا ہے کہ ایک بار چند طلبہ تفریح کے لیے ایک کشتی پر سوار ہوئے، طبیعت موج پر تھی، وقت سہانا تھا، ہوا نشاط انگیز اور کیف آور تھی، اور کام کچھ نہ تھا، یہ نوعمر طلبہ خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے، جاہل ملاح دلچسپی کا اچھا ذریعہ، اور فقرے بازی، مذاق وتفریح طبع کے لیے نہایت موزوں تھا، چنانچہ ایک تیز وطرار صاحبزادہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ''چچا میاں آپ نے کون کون سے علوم پڑھے ہیں؟''

ملاح نے جواب دیا: ''میاں میں کچھ پڑھا لکھا نہیں''

صاحبزادہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''ارے آپ نے سائنس نہیں پڑھی؟''

ملاح نے کہا: ''میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔''

دوسرے صاحبزادہ بولے ''اقلیدس اور الجبرا تو آپ ضرور جانتے ہوں گے؟''

ملاح نے کہا: ''حضور یہ نام میرے لیے بالکل نئے ہیں۔''

اب تیسرے صاحبزادہ نے شوشہ چھوڑا، ''مگر آپ نے جغرافیہ اور تاریخ تو پڑھی ہی ہوگی؟''

ملاح نے جواب دیا: ''سرکار یہ شہر کے نام ہیں یا آدمی کے؟''

ملاح کے اس جواب پر لڑکے اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے، اور انہوں نے قہقہہ لگایا۔ پھر انہوں نے پوچھا: ''چچا میاں تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

ملاح نے بتلایا: ''یہی کوئی چالیس سال''۔

لڑکوں نے کہا، ''آپ نے اپنی آدھی عمر برباد کی اور کچھ پڑھا لکھا نہیں''۔ ملاح بیچارہ خفیف ہوکر رہ گیا، اور چپ سادھ لی۔

قدرت کا تماشا دیکھیے کہ کشتی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دریا میں طوفان آ گیا، موجیں منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی تھیں، اور کشتی ہچکولے لے رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی، دریا کے سفر کا لڑکوں کا پہلا تجربہ تھا، ان کے اوسان خطا ہوگئے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اب جاہل ملاح کی باری آئی، اس نے بڑی سنجیدگی سے منہ بنا کر پوچھا: ''بھیا، تم نے کون کون سے علم پڑھے ہیں؟''

لڑکے اس بھولے بھالے جاہل ملاح کا مقصد نہیں سمجھ سکے، اور کالج یا مدرسہ میں پڑھے ہوئے علوم کی لمبی فہرست گنانی شروع کردی اور جب بھاری بھرکم اور مرعوب کن نام گنا چکے تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ''ٹھیک ہے یہ سب تو پڑھا، لیکن کیا تیرا کی بھی سیکھی ہے؟، اگر خدانخواستہ کشتی الٹ جائے تو کنارہ کیسے پہنچ سکو گے؟''

لڑکوں میں کوئی بھی تیرنا نہیں جانتا تھا، انہوں نے بہت افسوس کے ساتھ جواب دیا ''چچا جان! یہی ایک علم ہم سے رہ گیا، ہم اسے نہیں سیکھ سکے۔''

لڑکوں کا جواب سن کر ملاح زور سے ہنسا، اور کہا ''میاں میں نے تو اپنی آدھی عمر کھوئی مگر تم نے تو پوری عمر ڈبودی، اس لیے کہ اس طوفان میں تمہارا پڑھا لکھا کچھ کام نہ آئے گا، آج تیرا کی ہی تمہاری جان بچا سکتی ہے، اور وہ تم جانتے ہی نہیں۔'' (ابوالحسن علی ندوی، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ 1978ء صفحات 40 تا 41)

اس تمثیل سے علم دین کی اہمیت اور علماء کے عالی مقام منصب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دین اور شریعت کا علم غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ مادی ترقی اور انسانی ذہن وتجربات پر مبنی علوم ثانوی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر انسان اپنی اور اس کائنات کی حقیقت، اپنے مقصد وجود، اور اپنی غایت ومنزل سے بے خبر ہو تو اندازہ لگائیے کہ کتنے بڑی محرومی سے وہ دوچار ہے۔ اس دین کی حقیقت اور اس کا صحیح تصور،

اس کی دعوت اور اس کی صحیح حکمت عملی کے حوالے سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ختم نبوت کے بعد دین کی دعوت اور انذار کی ذمہ داری اصلاً علماء پر عائد ہوتی ہے اس لیے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وہ اپنے اندر قرآن وسنت کی گہری بصیرت پیدا کریں تا کہ پورے اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ دین کی شرح و وضاحت کا کام انجام دیں اور قرآن وسنت سے براہ راست استنباط کی صلاحیت ان کے اندر موجود ہو۔اس کے ساتھ ہی ان کی نظر امت کی علمی روایت پر بھی ہوتا کہ ضرورت پڑنے پر ان سے بھی استفادہ کیا جا سکے نیز وہ اپنے عہد کی علمی،فکری،تہذیبی،سیاسی،اقتصادی اور سائنسی روایات پر بھی نظر رکھتے ہوں تا کہ ان تبدیلیوں کا صحیح ادراک ہوتا کہ رہنمائی کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔ان کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اندر تقوی،خشیت الٰہی اور اپنے پروردگار سے زندہ تعلق قائم ہو،ایک جانب وہ اپنے رب کی سچی معرفت اور اس کی وفاداری سے سرشار ہوں اور دوسری جانب اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہ ہوں۔اگر دین وشریعت کے نام پر غلط باتیں اور دین کی غلط تصویر پیش کی جا رہی ہو تو نہایت شائستگی،متانت اور علم واستدلال کی بنیاد پر اس کا رد پیش کرنے سے قاصر نہ رہیں۔خود بھی انصاف پر قائم رہیں،انصاف کی گواہی دیں اور انصاف کی دعوت دیں۔تا کہ ہمارا شمار اس گروہ میں ہو جس کی بشارت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں دی ہے:

لا تزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق لا يضر هم من خذلهم حتى يأتي امر الله۔

(میری امت کا ایک طبقہ حق کے ساتھ ہمیشہ غالب رہے گا اور ان کا مخالف انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔)

محمد اسماعیل فلاحی،استاذ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز،نئی دہلی،
موبائیل نمبر:07827332996

اصولی طور پر شریعت کا تحفظ اپنی بساط بھر ملت کے ہر باشعور فرد کی ذمہ داری ہے۔ہاں جن کے پاس کتاب وسنت کا علم ہے ان کی جواب دہی اسی حساب سے ہے۔شریعت اللہ تبارک وتعالیٰ نے محفوظ کر دی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔اب سارا کام شریعت کے فہم،اس کے مطابق عمل اور سارے انسانوں تک ہدایت ربانی کو اس طرح پہنچانا ہے کہ ایک چلتا پھرتا ربانی معاشرہ وجود میں آجائے۔اس سلسلہ میں چند باتیں ملحوظ رہیں تو مناسب ہوگا:

(۱) شریعت کا تنہا ماٗ خذ اب تا قیامت اس زمین پر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ شریعت صحابہ کرامؓ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے قرآن مجید اور سنت کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔ نیز آپؐ کی سیرت طیبہ، آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور دین سے متعلق آپؐ کے شرح و بیان جاننے کا سب سے اہم ذریعہ حدیثیں ہیں، بشرطیکہ وہ قرآن وسنت اور علم و عقل کی مسلمات سے متغایر نہ ہوں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی حدیثِ رسول قرآن وسنت اور علم و عقل کے مسلمات سے متغایر اور متصادم نہیں ہوسکتی۔ حدیث کے باب میں مغایرت اور عدم مطابقت کی بات کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے قائل کے نزدیک مضبوط بنیادوں پر اس کے عقل و فہم اور مبلغ علم کے مطابق وہ حدیثِ رسول ہے ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس کی رائے سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اکابر فقہاء قرآن کے بالمقابل بعض روایات نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں۔

(۲) دین کے کچھ اصول وکلیات ہیں اور ان کی ایک روح ہے جن میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ان سے متعلق کچھ فروعی چیزیں ہیں جن میں اختلاف ممکن ہے اور یہ اختلاف تنوع کی حیثیت رکھتا ہے اس سے آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی چیزوں پر سمجھنے سمجھانے کے لیے گفتگو پسندیدہ ہے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہ فروعات مدار دین وایمان نہیں، اس لیے اصول کو اصول کی حیثیت دینی چاہیے اور فروع کو فروع کی حیثیت۔

(۳) ہمارے متقدمین اور ائمہ نے اپنے اپنے مخصوص ماحول اور احوال کے مطابق دین کو جیسا کچھ سمجھا بیان کیا، مختلف امور میں شریعت کا حکم جاننے کے لیے حالات وظروف کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ان کے شاگرد بہت سارے مسائل میں اختلاف کرتے نظر آتے ہیں اس کی بالعموم وجہ احوال وظروف کے اختلاف کے علاوہ کیا ہے؟ عین ممکن ہے کہ ان کے استاد محترم کے سامنے بھی وہ حالات ہوتے تو ان کا موقف بھی ان سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔

اس اصولی بات کی روشنی میں ہمارے علماء کو آج کے حالات اور آج کے مسائل میں اولاً از سرِ نو قرآن وسنت اور اسوۂ نبوی پر براہ راست غور وفکر کرنا چاہیے پھر اسلاف کی کوششوں سے بھی بھرپور استفادہ ہونا چاہیے۔ یہ شاید کوئی بہت اچھی بات نہیں ہوگی کہ آج کے احوال وظروف میں ان کی ہر بات کو دہرانا ہی ہم اپنی خوبی سمجھیں، ان کی عظمتوں کے تمام تر اعتراف کے باوجود وہ بہرکیف انسان تھے، انسانِ غیر معصوم۔ ان سے بھی خطا وصواب دونوں کا احتمال ہے۔ اس دور کے علماء سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ اپنے اسلاف کے استنباطات کو دہرایا یا نہیں؟ ہاں یہ سوال ضرور ہوگا کہ قرآن وسنت اور اسوۂ نبوی پر

کتنا غور کیا۔ ایسا تو نہیں کہ تم نے آنکھ بند کر کے اپنی لگام انھیں پکڑا دی ہو اور اس طرح عملاً تمہارا وہی حال ہو گیا ہو جس پر اہل کتاب کو ''اتخذو أحبار هم ورهبانهم ارباباًمن دون اللّه'' کہہ کر نکیر کی گئی تھی۔

مذکورہ بالا باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے متقدمین کی تشریحات اور ان کے استنباطات اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود قرآن وسنت کا درجہ نہیں لے سکتے۔ ان کی حیثیت بہرصورت تشریح واستنباط کی ہے۔ اصلِ قرآن وسنت یا اصلِ دین وشریعت کی نہیں۔ ان کے استنباط سے آج اگر کوئی اختلاف کرتا ہے تو اسے دین وشریعت سے اختلاف یا مخالفت کا نام دینا صحیح نہیں ہوگا۔

(۴) اس چیز پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مختلف امور میں کون سی چیز مقصود اصلی کی حیثیت رکھتی ہے اور کس کا یہ مقام نہیں ہے۔ آپؐ ناقہ پر سفر کرتے تھے، آج ہوائی پروازوں کے ذریعہ سفر کرنا خلافِ سنت نہیں کہلائے گا۔ مسواک کا اصل مقصود دانتوں کی صفائی ہے کسی مخصوص لکڑی کا استعمال نہیں ہے، آج لوگ مختلف قسم کے منجن اور ٹوتھ برش کا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ منجن اور ٹوتھ برش کا استعمال سنت کی مخالفت اور گناہ کا کام ہے۔ آپؐ نے فرش پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ کرسی اور ٹیبل پر کھانے والے سنت مخالف ہیں۔ لباس سے مقصود ستر پوشی اور زینت ہے اور بس، اب یہ کہنا کہ یہ کرتا، پائجامہ، عمامہ، ٹوپی، شیروانی، یا عربوں کا جبہ شرعی لباس ہیں اور دوسرے بہت سے ساتر لباس جن کا مختلف علاقوں میں رواج ہے، ساتر ہیں لیکن غیر شرعی ہے۔ بالوں کو انچوں سے ناپ کر زائد تر شوا دینا یا منڈوا دینا اور اس پر اصرار کرنا کیا حکیمانہ عمل ہے؟

بہت سی چیزیں مقامی عادات، وسائل وذرائع، آب وہوا اور موسم کے اعتبار سے مختلف جگہوں کی مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شریعت کی چوہدی اور مصالح عامہ کی کس قدر رعایت ہے۔ اسی حساب سے ان کے بارے میں کوئی حکم لگایا جاتا ہے۔

یہ چند امور تھے جو ہمارے سامنے ہونے چاہئیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ

(الف) قرآن وسنت اور حدیث پر غور کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس عربی کی کافی مشق وممارست بہم پہنچانی ہوگی، جو دورِ جاہلیت، عہد نبوی اور عہد صحابہ وتابعین کی عربی ہے، اس عربی کا اسلوب، اس کے اشارے کنائے، استعارے، تمثیلات، محاورے، اس کا انداز تخاطب، ایجاز واطناب، تعمیم وتخصیص، مقاماتِ حذف، وصل وفصل یہ اور اس طرح کے بہت سارے امور کا آدمی اداشناس ہو جائے، تب جا کر قرآن وسنت اور حدیث پر تدبر کا حق کسی حد تک ادا ہو سکے گا۔ اس کے بعد قرآن پر غور

کے لیے اس کے نظم کلام کی رعایت از حد ضروری ہے۔ایسا ہی حدیث کا معاملہ ہے اس میں بہت حساس ہونا ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو حدیثِ رسول نہ ہو اسے ہم حدیثِ رسول قرار دے بیٹھیں یا جو حدیثِ رسول ہو اس کا انکار کر دیں۔اس پورے سفر میں قرآن کو دوسری ہر چیز پر حَکَم کی حیثیت دینی ہوگی۔یہ بہت محنت طلب کام ہے۔آج بالعموم اس طرح سے نہ قرآن پڑھا جاتا ہے اور نہ پڑھایا جاتا ہے اور نہ ادب عربی کی تعلیم قرآن کو مرکز و محور بنا کر دی جاتی ہے۔

(ب) ہمارے علماء کو جو کام کرنا ہے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے دلوں میں وسعت نہ پیدا ہو، اپنے سے مختلف آراء رکھنے والوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سننے کے ہم عادی نہ ہوں۔سب سے اہم بات یہ کہ دین و شریعت کے معاملہ میں کسی مسلک کی مخصوص عینک ہماری آنکھوں پر نہ ہو اور ہماری گردنوں پر ائمہ تفسیر، ائمہ حدیث، ائمہ فقہ اور صاحبانِ تزکیہ و سلوک میں سے ان کی عظمتوں، کاوشوں کے اعتراف کے باوجود کسی کا قلادہ نہ ہو۔ہمیں دین و شریعت کے معاملہ میں ہر طرح کے مذہب و مسلک و مشرب سے اوپر اٹھنا ہوگا۔

(ج) یہ سمجھنا کہ ہم ہی مخلص ہیں اور حق ہمارے ہی اندر دائر و منحصر ہے اور دین شریعت پر ہماری ہی اجارہ داری ہے، دوسروں کے اندر نہ اخلاص ہے اور نہ ان کے پاس حق ہو سکتا ہے اور نہ ہی انھیں دین و شریعت کے معاملہ میں بولنے کا اختیار ہے، یہ سوچ ہماری بھول ہے۔اس ذہن کو ہمیں بدلنا ہوگا۔

ایک ضمنی بات: برطانوی استعمار کے دور میں مسلمانوں کے پرسنل لا کے نام سے جو قانون بنایا گیا اس کی مختلف دفعات قابل غور ہیں۔ہمیں کسی دوسرے کی مداخلت ہرگز گوارا نہیں لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہمارے علماء اس طرح کے بعض مسائل میں باہم تبادلہ خیال کی آزادانہ راہ نکالیں اور جن مشکلات سے ہماری ملت دوچار ہے، ان کا حل ڈھونڈیں۔ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر ہم نے حل نہیں نکالا تو ہمیں ناگوار ہونے کے باوجود اربابِ اقتدار نچلے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔

عبدالرحیم قریشی، مہاراشٹر، موبائل نمبر:08149778060

قرآن مجید کی آیت ہے: انما یخشی الله من عباده العلماء۔ علماء دراصل دین کی علمی روح اور دین کے عملی تقاضوں سے عوام کے مقابلے میں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔اسی لیے بجا طور پر اہل علم سے یہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں کہ جس شریعت کی تقدیس، اور کامیابی کی ضمانت کا اعلان کرتے کرتے علماء نہیں تھکتے انہیں ہی اوّل المسلمین ہونا چاہیے۔علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر

یا حلقہ ارادت میں دین اسلام کی تعبیر وتشریح اور اس کے احکام پر عمل آوری پر اپنے پیچھے چلنے والے عوام کو متوجہ کریں اور خود بھی شریعت پر عمل آوری کو یقینی بنائیں۔اسی طرح شریعت کے تحفظ کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔عوام کالانعام ہوتے ہیں، اس لیے بہت ہی دردمندی اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ عوام الناس کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے۔اسی طرح اصلاح معاشرہ کے ذیل میں خواتین کو بھی برابر مخاطب کیا جائے کہ ہماری آئندہ نسلوں کی ترقی اور دین اسلام کے بقاوتحفظ، اقامت اور خلافت ارضی کا حصول اسی سے ممکن ہوگا۔

تاریخ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ جب جب اہل حق اور علماء نے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا، وسیع پیمانے پر دین اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا، تب تب معاشرہ میں امن وسکون قائم رہا۔فی زمانہ طاغوت کے سرغنہ اور فسطائیت کے علم بردار فرقہ پرست ارباب حل وعقد اسلام اور اہل اسلام کے خلاف سازشوں میں کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ایسے وقت میں علماء کی ذمہ داریاں دوچند ہوجاتی ہیں، اللہ توفیق دے،بیدہ الخیر وھو یھدی السبیل

ذوالفقار علی فلاحی، نیپال، موبائیل نمبر:009779807050292

اس وقت مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ تحفظ شریعت کا مسئلہ ہے جس کے لیے علماء کی موجودہ کاوشیں بہت حد تک قابل قدر ہیں۔مگر یہ ساری کوششیں عارضی ہیں جو کی گئیں۔لہٰذا اس سلسلہ میں ٹھوس اور پائیدار اقدام انتہائی ضروری ہے۔ذیل میں کچھ مشورے ہیں جو غور وفکر کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں، امید ہے علمائے امت اس جانب توجہ دیں گے۔

سب سے پہلی بات جس کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم امت مسلمہ ہیں جو کہ امت واحدہ ہے، لہٰذا علمائے کرام اور شریعت اسلامیہ کے ماہرین اس پوری امت کے قائد ہیں نہ کہ کسی ایک مسلک کے نمائندے یا قائد، انہیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی ہوگی۔جب تک یہ بات ذہن نشین نہیں رہے گی تب تک شریعت اسلامیہ کے تحفظ کی جانب کوئی مطلوبہ اور متحدہ کوشش نہیں کی جاسکتی ہے، الا یہ کہ امت کے اوپر کوئی ایسی حالت طاری کردی جائے جس کے سبب سارے دینی قائدین موجودہ حالت کی طرح حالت اضطرار میں داخل ہوجائیں، اور ایسے وقت میں وہ کچھ کوشش کریں گے بھی تو وہ بارآور اور دیرپا نہ ہوگی۔کسی بھی حفاظتی کوشش کا سب سے بہترین طریقہ اقدام ہے یعنی کسی ہنگامی حالت کے پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے، تحفظ شریعت کے لیے اسی تناظر میں چند عملی نکات پیش

خدمت ہیں، امید ہے ان پر توجہ دی جائے گی:

(۱) اس اہم فریضہ کی ادائیگی بغیر ٹھوس منصوبہ بندی کے ممکن نہیں ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں طویل مدتی، متوسط مدتی اور قصیر مدتی منصوبہ بندی کی جائے اور اس منصوبہ کو باریک بینی سے روبہ عمل لایا جائے۔

(۲) عام مسلمانوں کو مسلکی حد بندیوں سے اوپر اٹھانے اور ان کے اندر سے اختلافات کو ختم کرنے کی غرض سے ان کے اندر امت واحدہ ہونے کا شعور بیدار کیا جائے۔

(۳) ان کے اندر دین اسلام کی عظمت اور شریعت اسلامی سے محبت پیدا کی جائے، ان کو شریعت پر عمل کے لیے ابھارا جائے۔ اس کام کے لیے مناسب اور عملی طریقے اپنائے جائیں۔

(۴) شریعت کی پیروی میں ہی دنیاوی عزت اور اخروی نجات ممکن ہے یہ بات مسلمانوں کو ذہن نشین کرائی جائے۔

(۵) اسلام اور اسلامی شریعت کے تئیں عام برادران وطن کے اندر بڑے پیمانے پر ناواقفیت پائی جاتی ہے اور بہت تھوڑے لوگ ہیں جو جان بوجھ کر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کر رہے ہیں، اس لیے ان کو اسلام سے واقف کرانے کی مہم چلائی جائے تا کہ اسلام کا نظام عدل وقسط ان کے سامنے واضح ہو سکے اور اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ان کی غلط فہمی دور ہو سکے، مسلمانوں سے ان کے روابط بہتر ہوں، اور بہت ممکن ہے کہ اسلام کی حقانیت کو جاننے کے بعد وہ اس سے دور بھی نہ رہ سکیں۔

(۶) قرآنی آیات واحادیث سے مزین اسلام کے تعارف پر مشتمل فولڈرس، کتابچے اور کتابیں مطلوبہ زبان اور تعداد میں شائع کی جائیں اور انہیں عام مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے اور انہیں پڑھنے پر آمادہ کیا جائے۔

(۷) گاؤں کی اکائی سے لے کر اعلی سطح تک کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جن میں ہر طرح کے علماء کی شمولیت ہو۔ اس کام کو بتدریج کیا جائے، تا کہ فطری انداز میں کام کا دائرہ وسیع ہوتا جائے۔

(۸) مساجد کو مسلمانوں کی دینی تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا جائے اور وہاں باقاعدہ قرآن وحدیث اور سیرت وفقہ کے دروس کا سلسلہ شروع کیا جائے، تا کہ امت کا دین کے اصل سرچشموں سے تعلق استوار ہو سکے۔

(۹) دینی مدارس کے نظام تعلیم کو ایسا بنایا جائے کہ وہاں سے علمائے مسلک تیار ہونے کے بجائے علمائے امت تیار ہوسکیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی عملی تربیت پر بھی توجہ دی جائے اور ان کے اندر

اسلامی قیادت کوابھارا جائے۔

(۱۰) اس بات کی مہم چلائی جائے اور ذہن سازی کی جائے کہ مسلمان اپنے مسائل کو اپنے یہاں قائم کمیٹیوں کے پاس ہی لے جائیں اور وہیں ان کا حل تلاش کریں اور لازماً اس کے فیصلوں کی پابندی کریں، اس طرح کی عمومی فضا بنانے کی کوشش کی جائے۔

تحفظ شریعت کے سلسلہ میں یہ چند نکات ہیں جو پیش خدمت ہیں، اگر یہ اور اسی طرح کے غور وفکر کے نتیجے میں سامنے آنے والے نکات پر توجہ دی جائے اور عملاً اس کام کو کرنے کے لیے علماء اٹھ کھڑے ہوں تو بہت ممکن ہے کہ ان سے بھی زیادہ مفید اور عملی بہت سے نکات سامنے آئیں گے اور نہ صرف یہ کہ موجودہ بلائل سکے گی بلکہ اسلام کی طرف عام انسانوں کا جھکاؤ بھی ہوگا اور نئے آنے والے افراد ہم سے زیادہ مستعدی کے ساتھ شریعت کے محافظ بن کر کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حسن تدبیر وعمل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین ثم آمین!

سراج حبیب فلاحی، نئی دہلی، موبائیل نمبر: 09911874285

شریعت میں مداخلت کی کوشش کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر زمانے میں فتنہ پرور لوگ شریعت میں ردّ وبدل کی ناپاک کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی شروعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ہوگئی تھی۔ بعض قبیلوں نے زکوۃ دینے سے منع کر دیا تھا، گویا یہ ایک طرح سے شریعت ودین میں مداخلت کی کوشش کی تھی۔ صدیق اکبرؓ نے برملا کہا کہ جو زکوۃ نہیں دے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا، آپؓ نے اپنے مضبوط ایمانی جذبے سے اس فتنے کا سر کچل کر رکھ دیا۔ آپؓ کا وہ تاریخی جملہ اسی مداخلت کے پیش نظر تھا کہ ''میرے جیتے جی دین میں کمی ہوجائے یہ کیسے ممکن ہے''۔

ہندوستان میں اسلامی شریعت میں مداخلت کی کوششیں بھی کافی پرانی ہیں۔ جب اسلام یہاں پہنچا اس وقت ہندو مذہب یہاں کے لوگوں کے بدن میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔ ایک خدا کی پرستش کا تصور نہیں تھا، ہر مضبوط کے آگے سر جھکانا ہندوستانیوں کی عادت بن چکی تھی، ایسے میں اسلام ایک خدا کی پرستش کی دعوت لے کر آیا اور الٰہی قوانین کو عام کیا تو لوگوں نے اسے قبول بھی کیا لیکن وہ طبقہ جو حاکم تھا اسے یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے ہمیشہ فتنہ پروری کی کوشش کی۔ کیونکہ خالص شرعی قوانین پر عمل کرنے سے ان کی حکمرانیت کو شدید خطرہ لاحق تھا۔

ہندوستان میں مغلیہ دور میں خصوصاً اکبر کے زمانے میں تبدیلی کی ایک ناپاک تحریک شروع ہوئی

اور اکبر نے دین اسلام کی جگہ دین الٰہی یا دین اکبری کی بنیاد رکھی جسے اس وقت کے ایمان فروش علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس عظیم فتنے کا سر کچلنے کے لیے شیخ احمد سرہندیؒ جنھیں مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے آگے آئے اور آپ کی کاوشوں نے اسلامی شریعت میں تبدیلی کی اکبری کوششوں کو ناکام کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اسلامی قانون ہی ملک کا قانون تھا، اور عائلی وفوجداری کے سارے معاملات شرعی حدود کے مطابق حل ہوتے تھے۔ تاہم غیر مسلم اقوام کو ان کے عائلی مسائل میں ان کے اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔ انگریزی اقتدار کی آمد کے بعد انگریز بھی اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، البتہ رفتہ رفتہ انگریزی قانون نافذ ہوگیا، لیکن عائلی قوانین میں ہر مذہب کو اس پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔ آزادی کے بعد ملک کا دستور سیکولر بنا جس میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کی کھلی چھوٹ دی گئی۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روز اول سے ملک میں فتنہ پرور طبقہ سرگرم رہا جس کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی تشخص کو ختم کرنا اور انھیں ملک کی تہذیب میں ضم کرنا تھا۔ چنانچہ یہ طبقہ ہمیشہ دستور کے رہنما اصولوں کا سہارا لے کر شریعت میں مداخلت اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ کرتا رہا۔ انھیں فتنہ پروروں کی کوششوں پر لگام لگانے کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، چنانچہ بورڈ نے شریعت کے تحفظ کے لیے سیاسی وقانونی کوششیں کیں اور یہ عمل جاری ہے۔

آج جبکہ دین وشریعت میں مداخلت کے نت نئے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، ہماری ذمہ داریاں بھی کئی گنا بڑھ گئی ہیں، ہمیں یہ کہنا ہوگا اور مسلم عوام کو بھی سمجھانا ہوگا کہ ہم خود اسلامی شریعت پر عمل کریں، اس کے مطابق اپنی زندگیاں گزاریں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری شریعت سے محبت صرف اور صرف زبانی ہے عملی نہیں۔ کیونکہ شریعت میں مداخلت اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب ہم خود شریعت پر عمل کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ سپریم کورٹ یا دیگر فسطائی طاقتوں کو شریعت میں تبدیلی کے مطالبہ کا موقع اسی وقت ملتا ہے جب خود مسلمان اپنے اختلافات کو قرآن وسنت کے مطابق حل کرنے کے بجائے عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ حال میں جو طلاق ثلاثہ کا مسئلہ سامنے آیا ہے وہ بھی مسلمانوں کے غیر شرعی طرز عمل کے سبب آیا ہے۔ بعض مسلم خواتین نے عدالت سے رجوع کرکے طلاق ثلاثہ کو کالعدم کرنے کی درخواست دی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے شوہروں نے غیر شرعی طلاق دی تھی۔

مسلمانوں کا شریعت پر عمل نہ کرنے کا ایک سبب جہالت بھی ہے، اس جہالت کو دور کرنے کے لیے علماء کرام کو آگے آنا پڑے گا، انھیں مسلم عوام کے سامنے شریعت کو آسان لفظوں میں پیش کرنا ہوگا، ان

کے دلوں میں اس کی دینی ودنیوی اہمیت کواجاگر کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی زندگی میں شرعی قوانین کو باعث رحمت سمجھیں۔مسلمانوں کو یہ سمجھانا ہوگا کہ ان کا ہر مسئلہ قرآن وسنت سے جڑا ہے، اور وہ اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ اپنے معاملات قرآن وسنت کے مطابق نہ حل کریں، اور یہ کہ قرآن میں اللہ کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔مسلم عوام کو یہ سمجھانا ہوگا کہ ہماری شریعت سے روگردانی اور دشمنوں کی طرف سے شریعت میں مداخلت پر ہنگامہ کرنا ہمارے منافقانہ رویے کی علامت ہے۔

اسلامی شریعت کو دوسروں سے زیادہ خود ہم سے خطرہ لاحق ہے۔ہم نے اسے کنارہ کردیا اپنی زندگیوں سے۔اس وقت شریعت میں مداخلت پر احتجاج کیا جارہا ہے، ریلیاں نکالی جارہی ہیں، یہ سب درست لیکن اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی ضروری ہے کہ ہم ایک ایک مسلمان تک پہنچیں، اس سے گزارش کریں کہ عائلی مسائل کا ضروری شرعی علم حاصل کرو اور اللہ کے واسطے زندگی کے معاملات میں شریعت پر عمل کرو، اگر خود نہیں عمل کروگے تو دوسروں کی مداخلت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ عام مسلمانوں کو شریعت کے علم سے آراستہ کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔مسلم نوجوانوں کو دین سے قریب کیا جائے، ان کی تربیت کے منصوبے بنائے جائیں اور انھیں اس طرف راغب کیا جائے کہ وہ اپنے معاملات میں علماء سے رابطہ کریں۔ہر بڑے شہر میں دارالقضاء کا قیام ہو اور اس سے مسلمانوں کو جوڑا جائے۔

مسلمانوں میں خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے۔ملت کے عام افراد میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ملک کی فرقہ پرست طاقتیں شریعت میں مداخلت کی پرزور کوششیں کر رہی ہیں، اس سے آگاہ رہنے کی ضرورت ہے اور اپنی کسی حرکت سے انھیں اس میں مداخلت کا مزید موقع نہ دیں۔

محمد اکمل فلاحی، استاذ الجامعہ الاسلامیہ، شانتاپرم، کیرالا، موبائیل نمبر: 09621458461

مختلف دور میں شرعی احکام وقوانین پر مختلف انداز سے حملہ ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں عصر حاضر کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت فرسودہ ہوچکی ہے، اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ

شرعی قوانین میں عورتوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی سے کام لیا گیا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں کیوں کہی جاتی ہیں؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ جس طرح کسی بیماری کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی صحیح تشخیص نہ ہو جائے، اسی طرح کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ پہلے اس کے اسباب کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔ غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شریعت کے خلاف کی جانے والی کوششوں کے پیچھے چند اہم اسباب ہیں اور وہ یہ ہیں:

الف: اسلام دشمنی

ب: سیاسی مفادات

ج: شرعی قوانین سے ناواقفیت

د: شرعی احکام و مسائل سے متعلق ناقص معلومات

ہ: شریعت سے بیزاری

یہ ایک حقیقت ہے کہ شریعت کے تحفظ کی خاطر علمائے امت نے ہر زمانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے اس کے لیے اپنی جان و مال کی بھی قربانی دی ہے، نیز اپنے وقت اور صلاحیت کی بھی قربانی دی ہے۔ حالیہ دنوں میں طلاق اور حقوق نسواں کے مسئلہ کو لے کر شرعی قوانین کے خلاف اٹھنے والی آواز علماء کو اس بات کی دعوت دے رہی ہے کہ شریعت کے تحفظ کی خاطر فکر مند ہوں اور سنجیدہ کوششوں کے ذریعے اپنا کردار ادا کریں، اس لیے کہ شرعی قوانین میں تبدیلی جان کے خطرے سے بڑھ کر ہے۔ یہ مسئلہ ایمان اور اسلام کے وجود اور عدم وجود کا مسئلہ ہے، اسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ صورت حال کے پیش نظر علماء کی ذمہ داریاں کئی لحاظ سے بڑھ گئی ہیں۔

......سب سے پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ شرعی قوانین کے لیے قرآن مجید ہی کو میزان بنایا جائے۔

......دوسری چیز یہ کہ سنت اور حدیث کے حوالے سے وہی باتیں قبول کی جائیں جو نصوص قرآنی کے موافق ہوں۔ تعارض کی صورت میں قرآن کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔

......تیسری چیز یہ کہ علماء اور فقہاء کی رایوں پر عمل کرنے سے پہلے آیات احکام پر ستر بار غور کرنا پڑے تو غور کیا جائے اور جب مسئلہ کا حل نکل آئے تو بغیر کسی تامل کے قرآن پر عمل کیا جائے، یہ بات ایک مثال کے ذریعے سے آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے، جمہور فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اگر چور دوبارہ

چوری کرے تو کاٹے گئے ہاتھ کے علاوہ پیر بھی کاٹا جائے گا۔ جبکہ قرآن صاف صاف کہتا ہے ''السارق والسارقہ فاقطعوا ایدیھما ''(المائدہ:30) قرآن نے قطع ید کے علاوہ کسی بھی دوسری حد کی بات نہیں کی ہے۔

......چوتھی چیز یہ کہ عوام الناس کو شرعی احکام کی حقیقی صورت حال سے واقف کرایا جائے اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کھول کھول کر بیان کیا جائے مثال کے طور پر میراث میں بیٹیوں اور بہنوں کا حق کیوں ہے؟

......پانچویں چیز یہ کہ سب سے پہلے علماء قرآن وسنت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں وہ خود کو لوگوں کے سامنے بہترین نمونہ بنا کر پیش کریں عملی طور پر یہ ثابت کریں کہ شرعی قوانین انسانیت کے لیے رحمت ہیں زحمت نہیں۔

......چھٹی چیز یہ کہ علماء لوگوں کے اندر دین کا صحیح شعور پیدا کریں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ انہیں دین کی حقیقت اور اس کی عظمت سے روشناس کرایا جائے، دین کی محبت ان کے دلوں میں بٹھائی جائے۔

......ساتویں چیز یہ کہ باہمی نزاع سے شدید گریز کیا جائے اور اپنی صفوں میں اتحاد (جو کہ فرض ہے) ہر صوت میں قائم کیا جائے فروعی مسائل میں الجھ کر اصولوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمیں حقیقی صورت حال کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عبدالحاکم مجاھد فلاحی، مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر: 8010803147

انسان دو چیزوں کا مرکب ہے، جسم اور روح۔ وہ اس دنیا میں خالقِ کائنات کی جانب سے نائب مقرر کیا گیا ہے۔اس نے اپنے نائبین کے لیے اس وسیع وعریض کائنات کو سورج، چاند، ستارے ،سیارے، سمندر، دریا، ندی، جھرنا، پہاڑ، ٹیلے، لاتعداد جنگلی اور پالتو جانور کے جوڑے اور ان میں طرح طرح کی نسلیں، انواع واقسام کی لاتعداد کھانے پینے کی اشیاء، رہنے سہنے کے لیے مکان اور بہت سے ایسی نعمتوں سے مزین کر دیا ہے، جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کا استعمال انسان اپنی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کرتا ہے۔ان تمام نعمتوں کے علاوہ ایک سب سے بڑی نعمت قرآن مجید ہے جو روح کو تر و تازہ رکھنے اور ہمیں خالقِ کائنات کی مرضی و ناراضگی بتانے کیے لیے نبی مکرم صلی اللہ علیہ

وسلم پر نازل کیا گیا ہے، اسی کو ہم شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

شریعت پر عمل کرنا اور اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتا ہے۔ انسان خطا ونسیان کا پتلا ہے، اس لیے اس سے ایسی بہت سی غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں جو خود اس کے لیے نقصان کا باعث اور شریعت کے لیے بدنامی کا سبب بنتی ہیں۔ ان غلطیوں کا اعتراف کرنا اور اس کے ازالے کی کوشش کرنا، یہ زندہ قوم کی صفات میں سے ہے۔

ہندوستان جیسے کثیر مذہبی ملک میں جو ذمہ داریاں شریعت کے تحفظ کے سلسلے میں ہم پر عائد ہوتی تھیں اور آزادی کے بعد سے وطن عزیز کے جو حالات بنے یا اسلام دشمن طاقتوں نے بنانے کی کوشش کی اس میں ہمارا رویہ برادرانِ وطن کے سامنے ایک حریف قوم کے طور پر ابھر کر آیا۔ دستور نے ملک کے شہریوں کو جو بنیادی سہولت فراہم کی اس کو حاصل کرنے میں ہمارا ایک لمبا عرصہ گزر گیا لیکن مسائل ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ نکاح، طلاق، خلع، ہبہ، یہ اور اس طرح کے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو وقفہ وقفہ سے ابھارا جاتا ہے۔ ایک سازش کے تحت پوری امت کو الجھا کر رکھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس میں ایسے الجھ کر رہ گئے کہ آج ہماری شخصیت مبہم ہوکر رہ گئی ہے۔ تحفظ شریعت کے تعلق سے ہمیں دوطرفہ یعنی خارجی اور داخلی میدانوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ خارجی میدان سے مراد ملکی حالات میں جمہوری نظام سے پورے طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے شریعت پر کیسے عمل پیرا رہا جائے اس کی تدبیر کرنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن مسلمانوں کے لیے نت نئے مسائل کو ابھارا جاتا ہے جس سے پوری امت بے چین ہوجاتی ہے۔ اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے امت کی یہ تڑپ قابل ستائش ہے لیکن اپنے فرضِ منصبی کو پسِ پشت ڈال کر محض ان مسائل میں پوری امت کا اس پر زور صرف کرنا دانائی و عقل مندی کے خلاف ہوگا۔

کاموں کی تنظیم اور اس کی تقسیم مسائل کے حل میں کتنی اہمیت رکھتی ہے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کام میں ضرورت سے زیادہ افراد لگ جانے سے مسائل کے حل کے بجائے کام کے بگڑنے کا خدشہ زیادہ رہتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے درمیان جتنی تنظیمیں اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کام کر رہی ہیں ان میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ امت کے تمام مسائل پر توجہ دینے کے بجائے کسی خاص ایک مسئلہ پر توجہ دے تو اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے آئے گا۔ دوسری تنظیموں کا ایک دوسرے سے ربط ایسا ہو کہ کوئی ایک تنظیم بھی اپنے کو دوسرے سے الگ محسوس نہ کرے۔ مثلاً اگر جمعیۃ العلماء مظلوم مسلمانوں کے کیسیز دیکھ رہی ہے تو دوسری تنظیموں کا اس کے لیے تعاون ضروری ہے۔ اسی

طرح اگر کوئی دوسری تنظیم مسلمانوں کے اصلاح معاشرہ کا پروگرام اپنے سامنے رکھتی ہے تو دوسری تنظیموں کا اس کو سپورٹ ملنا چاہیے۔

داخلی میدان سے مراد یہ ہے کہ امت کے اندر درآئی خرابیوں اور کوتاہیوں کو کیسے دور کیا جائے اور علماء اس معاملے میں اپنا کیا کردار ادا کر سکتے ہیں اس پر غور وفکر کرنا ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

(۱) مسلکی اختلافات نزاع کا سبب نہ ہوں: فقہی اور مسلکی اختلافات نے اس امت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دشمنانِ اسلام نے امت کی اس تفرقہ بازی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ فقہی اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مسلم سماج اور معاشرہ کے اندر اس بات کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں کہ فقہی اختلافات زحمت نہیں بلکہ رحمت کا ذریعہ ہیں اور شریعت سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے جس کو برداشت کرنے میں یا کسی مسلک کے زیادہ فروغ پاجانے سے دین ابراہمی کو نقصان کا اندیشہ ہے۔ تمام مسلمان چاہے وہ کسی بھی فقہ کے ماننے والے ہوں سب راہ ہدایت پر ہیں اور سب خدا اور اس کے رسول کے طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ جب ایسی صورت بنے گی تو ہم دیکھیں گے کہ اغیار کے حملے خود بخود رک جائیں گے اور اسلام کو ایک آفاقی دین سمجھا جانے لگے گا۔

(۲) مدارس کا ماحول: ہندوستان کے وسیع وعریض خطے میں لاتعداد مدارس ومکاتب کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں اکثریت ایسے مدارس ومکاتب کی ہے جس میں چند درجات پڑھا کر طلبہ کو فارغ کر دیا جاتا ہے پھر وہ اپنے مکتبۂ فکر کے لحاظ سے ایسے چند مدارس کی طرف رخ کرتے ہیں جن کا شمار ہندوستان کے نمایاں مدارس میں ہوتا ہے۔ طلبہ جس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا داخلہ ان ہی مکتبۂ فکر کے کسی چنندہ ادارے میں ہوجائے۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت تک ان کی عمر اس حد تک پہنچ چکی ہوتی ہے کہ کسی دوسرے مکتبۂ فکر کے ادارے میں داخلے کے خواہشمند ہوتے ہوئے بھی معاشی حالات ان کا ساتھ نہیں دیتے ہیں کہ مزید وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

مذکورہ مدتِ تعلیم کے بعد جب طلبہ ایک مخصوص فکر لے کر میدانِ عمل میں آتے ہیں تو ان کا سابقہ بہت سے ایسے مکاتب فکر کے لوگوں سے پڑتا ہے جو ان کے متضاد ہوتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے مدت تعلیم کے دوران ایک مخصوص فقہ سے استفادہ کیا ہوتا ہے، اس لیے فکری طور پر دوسروں کو قبول کرنے میں انہیں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ یہ دشواری دو فکر کے درمیان نزاع کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے ہمارے چنندہ اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے درمیان دین کا وسیع تصور عام کریں

تا کہ امت کے درمیان فقہی اختلافات کے سبب پیدا ہوئے خلا کو پر کیا جا سکے۔ اگر ایسا کچھ لائحۂ عمل طے کیا جائے تو آج ''ایک اسٹیج سے تمام مکتبۂ فکر کے لوگ جو برادرانِ وطن تک یہ بات پہنچانے کی کوشش کررہے ہیں کہ ہم آپس میں ایک ہی امت ہیں'' اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

(۳) اصلاح معاشرہ: اصلاحِ معاشرہ دراصل تحفظ شریعت کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر ہم ایک اچھی سوسائٹی کا تصور نہیں کرسکتے۔ سماج کے اچھے بن جانے سے شریعت کی حفاظت آسان ہو جاتی ہے۔ نوجوانوں کی بے راہ روی، نمازوں سے غفلت، سود، شراب اور آپسی نفرت وانتشار کا چلن عام ہو جانا، زکوۃ کا نظام کمزور ہو جانا، حلال کمائی سے غفلت، ماں باپ کی نافرمانی اور رشتہ داروں سے قطع رحمی کرنا، یہ اور اس طرح کے دوسرے کبائر مسلم سماج کو دیمک کی طرح کھوکھلا کررہے ہیں۔ سماج کے اندر جیسے لوگ پائے جائیں گے دین اور شریعت کو دوسرے ادیان و مذاہب کے لوگ اسی طرح تصور کریں گے۔ ایک انسان جب کسی دوسرے انسان سے متأثر ہوتا ہے تو پہلے وہ اس کے اچھے اخلاق کو دیکھ کر متأثر ہوتا ہے۔ مذہب کی حقیقی تعلیمات کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔

(۴) اسلام کا تعارف: برادران وطن کے درمیان اسلام کا تعارف کرانا ہر مسلمان کے لیے فرداً فرداً ضروری ہے۔ لیکن بحیثیت عالم دین ہونے کے یہ ذمہ داری اس پر دوگنی ہو جاتی ہے۔ برادرانِ وطن کے عقائد ایسے ہیں کہ ان کو ہر فائدہ پہنچانے والی چیز میں دیوتا نظر آتا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور قول ہے ہر ذرہ ان کے لیے دیوتا ہے۔ اسلام چونکہ مکمل انسان کی بھلائی چاہتا ہے، بعید نہیں کہ جب ان تک اسلام کا اصل پیغام پہنچے تو وہ خود اسلام کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

(۵) اسلام کو بحیثیتِ مکمل نظام حیات متعارف کرانا: مسلم امت کے درمیان اس چیز کو فروغ دینا کہ مسجد اور مسجد کے باہر کا اسلام ایک ہی ہے۔ ہماری امت کا ایک بڑا طبقہ حصول معاش کے لیے ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جس کو دنیاوی اصول و ضابطے بھی ناپسندیدگی اور حرام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۰)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱۰۵) من نفس واحدة کا ترجمہ

من نفس واحدۃ کی تعبیر قرآن مجید میں چار آیتوں میں آئی ہے، ان میں سے تین آیتوں میں منھا زوجھا کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ عربی تفاسیر میں خلقکم من نفس واحدۃ کا عام طور سے ایک ہی مفہوم ملتا ہے، یعنی ''ایک جان سے پیدا کیا'' اور خلق منھا زوجھا کے دو مفہوم ملتے ہیں ''اس سے اس کے جوڑے کو بنایا'' اور اس کی جنس سے اس کے جوڑے کو بنایا'' اردو تراجم میں شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو لوگوں نے عام طور سے اختیار کیا ہے جس میں ''ایک جان سے پیدا کیا'' اور ''اس سے اس کے جوڑے کو بنایا'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ البتہ دوسرے جملے کے ترجمہ میں بعض لوگوں نے دوسری رائے بھی اختیار کی ہے۔ ذیل میں درج ترجموں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاء۔ (النساء:۱)

''اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے بنایا تم کو ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا اور بکھیرے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔ (شاہ عبدالقادر)

اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے''۔ (سید مودودی)

(۲) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلاً خَفِيفاً فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحاً لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ۔ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحاً جَعَلاَ لَهُ شُرَكَاء فِيْمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔ (الاعراف:۱۸۹۔۱۹۰)

''وہی ہے جس نے تم کو بنایا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا کہ اس پاس آرام پکڑے پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا حمل رہا ہلکا سا حمل پھر چلتی گئی اس کے ساتھ پھر جب بوجھل ہوئی دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو اگر تو ہم کو بخشے چنگا بھلا تو ہم تیرا شکر کریں پھر جب دیا ان کو چنگا بھلا ٹھیرانے لگے اس کے شریک اس کی بخشی چیز میں''۔ (شاہ عبدالقادر)

''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے

تسکین پائے۔ تو جب وہ اس کو چھالیتا ہے تو وہ اٹھالیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے (کچھ وقت گزارتی ہے) تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ، اپنے رب، سے دعا کرتے ہیں اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی، ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں'' (امین احسن اصلاحی)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکرگزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش وعنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیرانے لگے۔'' (سید مودودی، اس ترجمہ میں ''دونوں نے مل کر'' کے بجائے ''دونوں نے'' ہونا چاہئے۔ ''مل کر'' زائد ہے)

(۳) خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقاً مِن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ۔ (الزمر:۶)

''بنایا تم کو ایک جی سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور اتارے تمہارے واسطے چوپاؤں سے آٹھ نر و مادہ بناتا ہے تم کو ماں کے پیٹ میں طرح پر طرح بنانا تین اندھیروں کے بیچ''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اسی نے پیدا کیا تم کو ایک ہی جان سے، پھر پیدا کیا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا اور تمہارے لیے (نر و مادہ) چوپایوں کی آٹھ قسمیں اتاریں۔ وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے۔ ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت میں، تین تاریکیوں کے اندر'' (امین احسن اصلاحی، اس ترجمہ میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ آٹھ قسمیں ترجمہ کیا ہے، درست ترجمہ ہے: آٹھ جوڑیاں۔ یعنی چار قسموں کی آٹھ جوڑیاں، جس کی تفصیل سورہ أنعام میں ہے)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔'' (سید مودودی)

(۴) وَهُوَ الَّذِيَ أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (الأنعام:۹۸)

''اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے۔ پھر ہر (ایک کے لئے) ایک مستقر اور

ایک مدفن ہے‘‘۔ (امین احسن اصلاحی، مستودع کا ترجمہ مدفن کیا ہے۔ مستقر کا مطلب عارضی قیام گاہ اور مستودع کا مطلب آخری قیام گاہ ہے، اس لئے مدفن ترجمہ کرنا مناسب نہیں ہے)

مذکورہ بالا ترجموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب تدبر نے پہلے اور تیسرے مقام پر منھا کا ترجمہ ’’اس کی جنس سے‘‘ کیا، جبکہ دوسرے مقام پر’’اسی سے‘‘ کردیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صاحب تفہیم نے اس کے برعکس پہلے اور تیسرے مقام پر’’اس جان سے‘‘ اور دوسرے مقام پر’’اسی کی جنس سے‘‘ ترجمہ کیا۔ غرض یہ کہ جنس والا ترجمہ دونوں کے پیش نظر رہا لیکن دونوں متعلقہ تینوں مقامات پر اس کا یکساں التزام نہیں کرسکے۔

ان آیتوں میں جب ہم خلقکم من نفس واحدۃ کا ترجمہ کرتے ہیں’’اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا‘‘ تو بہت سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، خواہ منھا زوجھا کا ترجمہ دونوں میں سے کوئی بھی کیا جائے۔ ان اشکالات کو تفسیروں میں تفصیل سے ذکر بھی کیا گیا ہے، اور ان کا جواب دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ تفسیر المنار میں اس مشہور مفہوم پر وارد ہونے والے اشکالات کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد ایک دوسرے مفہوم تک پہونچنے کی کوشش ملتی ہے جو اشکالات سے خالی ہو۔

ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے زوج بنایا یا پہلے ذریت پیدا کی؟ کیونکہ آیتوں کے مذکورہ مفہوم کے لحاظ سے تو یہ نکل رہا ہے کہ پہلے ذریت بنائی پھر زوج بنایا۔

ایک دوسرا اشکال یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی نے تخلیق آدم کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں یہ نہیں ذکر کیا کہ تم سب کی تخلیق آدم اور حوا سے ہوتی ہے۔ آدم اور حوا کی ذریت ہونا ایک بات ہے اور آدم اور حوا سے انسانوں کی تخلیق کرنا ایک دوسری بات ہے، اور اس دوسری بات کے لیے ہمیں کوئی دلیل نہیں ملتی ہے۔ صراحت صرف اس کی ملتی ہے کہ انسان کو مٹی’’طین‘‘ سے پیدا کیا گیا یا اس کی تخلیق پانی’’ماء‘‘ سے کی گئی۔ لیکن کوئی اپنے ماں باپ سے تخلیق کیا گیا ہو، یہ بات کہیں نہیں ملتی ہے۔ قرآن مجید میں نہ آدم وحوا کی تخلیق کے سیاق میں یہ کہا گیا کہ انسانوں کی تخلیق آدم وحوا یا ذکر اور انثی سے ہوئی ہے، اور نہ ہی انسانوں کی تخلیق کے سیاق میں یہ بات کہی گئی۔

خاص طور سے سورہ اعراف والی متعلقہ آیتوں میں عام مفہوم لینے سے ان آیتوں کی تفسیر بے حد مشکل ہوجاتی ہے، یا تو تفسیر تکلف سے دوچار ہوتی ہے، یا یہ ماننا پڑتا ہے کہ آدم وحوا شرک کے مرتکب ہوگئے تھے۔ ضعیف تفسیری روایتوں سے اس دوسرے مفہوم کی تائید بھی مل جاتی ہے، حالانکہ سیاق کلام کی رو سے وہ مفہوم ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا ہے۔ اس آیت میں مشہور مفہوم لینے کی صورت میں کتنی

دشواریاں پیش آتی ہیں اس کا اندازہ تفسیر رازی کا متعلقہ مقام پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی ان چاروں مقامات پر ایک مختلف ترجمہ تجویز کرتے ہیں جس سے وہ سارے اشکالات بھی دور ہو جاتے ہیں جن کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے اور وہ اشکالات بھی جو ان آیتوں پر تدبر کرنے والے کے ذہن میں آتے ہیں۔

ان کی رائے کے مطابق خلقکم من نفس واحدۃ میں ''من'' تجرید کا ہے، یعنی خلقکم فی صورۃ نفس واحدۃ یا خلقکم نفسا واحدۃ اور اس کا ترجمہ ہوگا ''اس نے تم کو ایک جان کی صورت میں (یعنی تن تنہا) پیدا کیا'' اور خلق منھا کا زوجھا کا ترجمہ ہوگا ''اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا'' گویا ہر انسان تنہا پیدا کیا گیا، اور ہر انسان کا جوڑا اسی کی جنس سے بنایا گیا۔ ہر انسان تن تنہا پیدا کیا گیا، اس مفہوم کی تائید قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے بھی ہوتی ہے، جیسے وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام:۹۴) ترجمہ: ''اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا'' اور ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيداً (المدثر:۱۱) ترجمہ: ''چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا''۔

اسی طرح خلق منھا زوجھا کا ترجمہ ان کے نزدیک اس طرح ہے: ''اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا'' یعنی ہر انسان کو تنہا پیدا کیا، اور اس کا جوڑا اسی کی جنس سے بنایا۔ اسی مفہوم کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں ہے، کہ نسل انسانی کی خاتون اول کو مرد اول سے تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن ایسی آیتیں موجود ہیں جو صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہیں کہ ہر انسان کے جوڑے کو اس کی جنس سے بنایا، انسان سے مراد صرف مرد نہیں بلکہ مرد بھی ہے اور عورت بھی ہے، یعنی دونوں ایک ہی جنس سے بنائے گئے۔ ذیل کی دونوں آیتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً (الروم ۲۱)

"واز نشانہائے خدا آن است کہ بیافرید برائے شما از جنس شما زنان را'' (شاہ ولی اللہ، اس ترجمہ میں اُزواج کا ترجمہ زنان محل نظر ہے، کیونکہ مردوں کے اُزواج عورتیں ہیں اور عورتوں کے اُزواج مرد ہیں)

"اور اس کی نشانیوں سے یہ کہ بنادیئے تم کو تمہاری قسم سے جوڑے'' (شاہ عبدالقادر)

(۲) فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً (الشوری ۱۱)

"آفریند ہ آسمانہا و زمین است پیدا کرد برائے شما از جنس شما زنان را'' (شاہ ولی اللہ)

"وہ آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تمہارے لئے تمہارے جنس کے جوڑے بنائے"(اشرف علی تھانوی)

ان دونوں آیتوں کا اسلوب وہی ہے جو خلق منها زوجها کا ہے۔لیکن ان دونوں آیتوں کا ترجمہ عام طور سے یہی کیا جاتا ہے کہ تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے، چونکہ یہاں جمع کا صیغہ ہے،اور عام انسانوں سے خطاب ہے،اس لئے یہ مفہوم نہیں لیا جاسکتا کہ حوا کو آدم سے تخلیق کیا گیا،اور یہ مفہوم تو کوئی نہیں لے گا کہ ہر عورت کو اس کے شوہر کے جسم سے تخلیق کیا گیا،لہذا یہ مفہوم لینا ضروری ہوگا کہ انسانوں کے جوڑے انسانوں کی جنس سے بنائے گئے۔ دراصل یہی مفہوم مذکورہ بالا ان تمام آیتوں کا بھی ہے جہاں نفس اور زوج جمع کے بجائے واحد آئے ہیں،فرق بس یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی پوری جماعت سے ایک ساتھ خطاب ہے، اور وہاں انسانوں کی جماعت کے ہر فرد سے فردا فردا خطاب ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں اس مبحث کی ابتدا میں مذکور چاروں آیتوں کا ترجمہ بالترتیب اس طرح ہوگا:

(۱)"اے لوگو اپنے اس رب کی نافرمانی سے بچو جس نے تم کو تن تنہا پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کی جوڑی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔"

(۲)"وہی ہے جس نے تم کو تن تنہا پیدا کیا اور اسی جنس سے اس کی جوڑی بنائی کہ وہ اس سے تسکین پائے۔تو جب وہ اس پر چھا گیا تو اس نے اٹھالیا ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے پھری جب بوجھل ہوگئی دونوں نے اللہ، اپنے رب، سے دعا کی اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی، ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔تو جب اللہ نے ان کو تندرست اولاد دے دی تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہرانے لگے۔اللہ برتر ہے ان کے شرک سے جو یہ مانتے ہیں"

(۳)"اس نے پیدا کیا تم کو تن تنہا، پھر پیدا کیا اسی کی جنس سے اس کی جوڑی اور تمہارے لیے (نر و مادہ) چوپایوں کی آٹھ جوڑیاں اتاریں۔ وہ تمھیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرتا ہے، تین تاریکیوں کے اندر۔"

(۴)"اور وہی ہے جس نے تم کو تن تنہا پیدا کیا۔ پھر ہر (ایک کے لئے) ایک عارضی قیام گاہ اور آخری قیام گاہ ہے"

اس مفہوم کو اختیار کرنے کے بعد پھر یہ بات بے وزن ہوجاتی ہے، کہ عورت کی تخلیق مرد سے کی گئی،اور تخلیق کے پہلو سے عورت مرد کا ضمیمہ ہے۔ بلکہ درست بات یہ ہے کہ جس طرح مرد مستقل طور پر

ایک نفس واحدۃ کے طور پر تخلیق کیا گیا ہے اسی طرح عورت بھی مستقل طور ایک نفس واحدۃ کے طور پر تخلیق کی گئی، اور جس طرح مرد عورت کا زوج ہے، اسی طرح عورت مرد کا زوج ہے، دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

(۱۰۶) من ذکر وأنثی کا ترجمہ

من نفس واحدۃ کے ترجمہ سے متعلق ایک اور بحث یہ ہے کہ ذیل کی آیت میں إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى کا ترجمہ کیا ہوگا؟:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ (الحجرات:۱۳)

عام طور سے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا، جیسا کہ ذیل کے ترجموں میں ہے:

''اے آدمیو ہم نے بنایا تم کو ایک نر اور ایک مادہ سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور گوتیں تا آپس کی پہچان ہو''۔ (شاہ عبدالقادر)

''تحقیق ہم نے پیدا کیا تم کو ایک مرد سے اور عورت سے اور کیا ہے ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے تو کہ ایک دوسرے کو پہچانو'' (شاہ رفیع الدین)

''اے لوگو ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم دگر تعارف حاصل کرو'' (امین احسن اصلاحی)

''لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو'' (سید مودودی، اس میں ''پھر'' زائد ہے)

تاہم مولانا امانت اللہ اصلاحی کو اس ترجمہ سے اتفاق نہیں ہے، ان کے مطابق قرآن مجید میں یہ بات تو ایک سے زائد مقامات پر کہی گئی ہے کہ نطفہ سے نر اور مادہ کی تخلیق کی گئی، لیکن یہ صراحت کہیں نہیں ملتی ہے کہ نر اور مادہ سے انسان کی تخلیق کی گئی۔ وجہ یہی ہے کہ انسان نر اور ناری کے توسط سے تو تخلیق پاتا ہے، لیکن اس کی تخلیق نر اور ناری سے نہیں ہوتی ہے۔ ہر انسان ایک منفرد تخلیق ہے، وہ کسی دوسرے انسان یا دو انسانوں سے تخلیق نہیں کیا گیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ من ذکر وأنثی میں ''من'' بیانیہ ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ مرد و عورت سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت میں من ذکر وأنثی کا وہی ترجمہ کیا جائے گا جو ذیل کی آیت میں من ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى کا ہے: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي

لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى(ال عمران ۱۹۵) ترجمہ:''تو اُن کے رب نے اُن کو دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کرتا''

یوں زیر نظر آیت کا ترجمہ ہوگا: ''اے لوگو ہم نے تم کو پیدا کیا وہ نر ہو یا ناری، اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم دگر تعارف حاصل کرو۔''

اس مفہوم کی تائید درج ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے، وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (النجم:۴۵) ترجمہ:''اور یہ کہ وہ ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد، نر اور ناری، پیدا کئے'' فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (القیامۃ:۳۹) ترجمہ:''پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ'' وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (اللیل:۳) ترجمہ:''اور شاہد ہے نر و مادہ کی آفرینش''

مذکورہ بالا ترجموں میں ایک بات اور توجہ طلب ہے کہ بعض لوگوں نے شعوبا کا ترجمہ ''کنبے'' کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، شعوبا کا ترجمہ ''قومیں'' ہوگا، شعب قبیلے سے بڑا ہوتا ہے جبکہ کنبہ جب قبیلہ کے ساتھ بولا جاتا ہے تو کنبہ قبیلہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔

(۱۰۷) القول علی اللہ کا مفہوم

قرآن مجید میں قول علی اللہ کی تعبیر مختلف صیغوں میں استعمال ہوئی ہے، اس تعبیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف کسی بات کو منسوب کر کے یہ کہنا کہ اللہ نے یہ بات کہی ہے، جب کہ کہی نہ ہو، یا یہ کہنا کہ اللہ ایسا کرتا ہے یا کرے گا، جب کہ ایسا نہ ہو۔ بعض مترجمین نے بعض مقامات پر اس کا ترجمہ اللہ پر تہمت لگانا اور بہتان باندھنا کیا ہے، یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ اس تعبیر کے اندر اللہ پر کسی طرح کی تہمت لگانے کا مفہوم نہیں پایا جاتا ہے۔ بعض مترجمین نے اللہ کی شان کے خلاف بات کہنے کا مفہوم بھی لیا ہے، وہ بھی اس لفظ کا اصل مفہوم نہیں ہے، اسی طرح بعض لوگوں نے اللہ کے ذمہ کوئی بات ڈالنے کا ترجمہ کیا ہے، یہ بھی الفاظ کے مطابق نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اللہ کے بارے میں کہنے کا ترجمہ کیا ہے، یہ بھی موزوں نہیں ہے۔

(۱) وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللّهِ عَهْداً فَلَن يُخْلِفَ اللّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔ (البقرۃ:۸۰)

''اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔ پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے''۔ (سید مودودی، اللہ کی طرف منسوب کر کے کہ اس نے وہ باتیں کہی ہیں)

''یا اللہ تعالی کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے'' (اشرف علی تھانوی)

''بلکہ تم خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں مطلق علم نہیں'' (فتح محمد جالندھری)

''یا تم اللہ پر یونہی (وہ) بہتان باندھتے ہو جو تم خود بھی نہیں جانتے'' (طاہر القادری)

درست ترجمہ ہوگا: ''یا تم اللہ کی طرف منسوب کر کے وہ باتیں کہہ رہے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے''

(۲) إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ ۔ (البقرۃ:۱۶۹)

''اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ کہ جس کی سند ہی نہیں رکھتے'' (اشرف علی تھانوی)

''وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی (کی راہ) سجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے'' (امین احسن اصلاحی)

دوسرا ترجمہ زیادہ مناسب ہے۔

(۳) بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۔ (آل عمران:۷۵)

''یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں'' (امین احسن اصلاحی)

(۴) وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۔ (آل عمران:۷۸)

''اور وہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ اور وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں'' (امین احسن اصلاحی)

(۵) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لاَ تَغْلُواْ فِي دِينِكُمْ وَلاَ تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ إِلاَّ الْحَقِّ ۔ (النساء:۱۷۱)

''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو'' (امین احسن اصلاحی)

''اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے زائد نہ بڑھو اور اللہ کی شان میں سچ کے سوا کچھ نہ کہو'' (طاہر القادری)

پہلا ترجمہ زیادہ مناسب ہے۔ یہاں اللہ کی شان میں کہنا مراد نہیں بلکہ کسی بات کو جو اللہ نے نہیں کہی ہے اسے اللہ کی طرف منسوب کر کے کہنا مراد ہے۔

(٦) الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّهِ غَيْرَ الْحَقِ۔ (الانعام:٩٣)

''آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے، بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے'' (امین احسن اصلاحی)

''آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے'' (سید مودودی)

''آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے'' (فتح محمد جالندھری)

یہاں تیسرا ترجمہ درست ہے، پہلے اور دوسرے ترجمہ میں تہمت جوڑنے اور رکھنے کا ترجمہ کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔

(٧) وَإِذَا فَعَلُواْ فَاحِشَةً قَالُواْ وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءنَا وَاللّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاء أَتَقُولُونَ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔ (الاعراف:٢٨)

''اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں، کہتے ہیں ہم نے اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا ہے۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں'' (امین احسن اصلاحی)

''کیا خدا کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی تم سند نہیں رکھتے'' (اشرف علی تھانوی)

''بھلا تم خدا کی نسبت ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں'' (فتح محمد جالندھری)

یہاں بھی اللہ پر تہمت جوڑنے یا اللہ کی نسبت کوئی بات کہنے کے بجائے کسی بات کو خدا کی طرف منسوب کر کے کہنا مراد ہے۔

(٨) قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً وَأَن تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔ (الاعراف:٣٣)

''کہہ دو میرے رب نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ، اور حق

تلفی اور ناحق زیادتی کو۔ اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کا کسی چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر کسی ایسی بات کا بہتان لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے'' (امین احسن اصلاحی)

یہاں بھی اللہ پر بہتان لگانا غلط ترجمہ ہے، صحیح ترجمہ ہے: اور یہ کہ تم اللہ کی طرف منسوب کر کے وہ بات کہو جس کے بارے میں تم کو علم نہیں ہے۔

(۹) وَقَالَ مُوسَى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ۔ حَقِيقٌ عَلَى أَن لاَّ أَقُولَ عَلَى اللّهِ إِلاَّ الْحَقَّ۔ (الاعراف:۱۰۴،۱۰۵)

''اور موسی نے کہا: اے فرعون میں خداوند عالم کا فرستادہ ہوں سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں'' (امین احسن اصلاحی، اس میں حریص کا لفظ زائد ہے)

''مجھے یہی زیب دیتا ہے کہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا (کچھ) نہ کہوں'' (طاہر القادری)

یہاں پہلا ترجمہ درست ہے۔

(۱۰) أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيْثَاقُ الْكِتَابِ أَن لاَّ يِقُولُواْ عَلَى اللّهِ إِلاَّ الْحَقَّ۔ (الاعراف: ۱۶۹)

''کیا ان سے در باب کتاب یہ میثاق نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ جوڑیں'' (امین احسن اصلاحی)

''کیا ان سے کتابِ (الٰہی) کا یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق (بات) کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے؟'' (طاہر القادری)

یہاں بھی پہلا ترجمہ درست ہے۔

(۱۱) قَالُواْ اتَّخَذَ اللّهُ وَلَداً سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَات وَمَا فِي الأَرْضِ إِنْ عِندَكُم مِّن سُلْطَانٍ بِهَـذَا أَتقُولُونَ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُون۔ (یونس:۶۸)

''یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ وہ ایسی باتوں سے پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ تمھارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے'' (امین احسن اصلاحی)

یہ ترجمہ درست ہے، البتہ قَالُوا اتَّخَذَ اللّهُ وَلَداً کا ترجمہ یہ نہیں ہوگا کہ ''یہ کہتے ہیں کہ خدا کے

اولاد ہے“ بلکہ یہ ہوگا کہ ”یہ کہتے ہیں کہ خدا نے کسی کو اولاد بنالیا ہے“۔

(۱۲) وَأَنَّهُ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطاً۔ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّن تَقُولَ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِباً۔ (الجن:۴،۵)

”اور یہ کہ ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ کے بارے میں حق سے بالکل ہٹی ہوئی باتیں کہتا رہا ہے اور یہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن خدا پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتے“ (امین احسن اصلاحی، القول علی اللہ کی تعبیر دونوں آیتوں میں آئی ہے، دونوں آیتوں میں الگ الگ ترجمہ کیا گیا ہے، جب کہ دوسری آیت کا ترجمہ زیادہ صحیح ہے، ایک چوک مترجم سے یہ ہوگئی ہے کہ دوسری آیت میں لن کا ترجمہ مستقبل سے نہیں کیا ہے، صحیح ترجمہ ہوگا ”ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھیں گے“)

”اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے“ (اشرف علی تھانوی)

”اور یہ کہ ہم میں سے بعض بیوقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افتراء کرتا ہے. اور ہمارا (یہ) خیال تھا کہ انسان اور جن خدا کی نسبت جھوٹ نہیں بولتے“ (فتح محمد جالندھری، جھوٹ نہیں بولتے کے بجائے جھوٹ نہیں بولیں گے ہونا چاہئے، کیونکہ ”لن“، مستقبل کے لئے ہوتا ہے)

”اور یہ کہ ہم میں سے کوئی احمق ہی اللہ کے بارے میں حق سے دور حد سے گزری ہوئی باتیں کہا کرتا تھا، اور یہ کہ ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ کے بارے میں ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے“ (طاہر القادری)

اس آیت کے مذکورہ ترجموں میں خدا پر جھوٹ باندھنے کا ترجمہ زیادہ صحیح ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ بعض مترجمین کے یہاں ایک ہی لفظ کے مختلف مقامات پر مختلف ترجمے ملتے ہیں، یا تو اسے تسامح سمجھا جائے، یا پھر ممکن ہے کہ ان کو ترجمے کے سلسلے میں تردد ہو، اور کسی ایک تعبیر پر اطمینان نہ ہو۔

محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ

ایک مظلوم اور بدنام مصلح

(مسعود عالم ندویؒ کی کتاب سے تلخیص واقتباسات)

محمد محفوظ فلاحی، ناظم جامعۃ الحکمۃ، بھوپال

محترم سید سلمان حسنی ندوی نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں محض تأثراتی انداز میں کچھ خیالات کا اظہار کیا ہے، اور دلیل میں بعض علماء کی ان کے بارے میں منفی آراء نقل کردی ہیں۔ یہ تأثرات ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئے ہیں اور ویڈیو کے ذریعہ بھی لوگوں تک پہنچے ہیں۔ اللہ کی پکار مارچ ۲۰۱۶ء کے شمارے میں بھی اس کو شائع کیا گیا ہے۔ مدیر اللہ کی پکار کا اس تأثراتی مضمون کو اہمیت دینا توقع کے خلاف معلوم ہوا۔

ایک ایسی شخصیت جو تاریخی حیثیت رکھتی ہو، جس کی اپنی تحریریں موجود ہوں اور جس کی برپا کردہ تحریک کا ایک مسلّم مفید رول رہا ہو اور آج تک اس کے اثرات محسوس کیے جارہے ہوں، اس پر اتنی سرسری تحریر اور اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت فہم سے بالاتر ہے۔ محترم مولانا سید رابع حسنی ندوی نے شاید اس غیر حقیقی تأثراتی تحریر کے اثر کو زائل کرنے کے لیے تعمیر حیات ۱۰؍جنوری ۲۰۱۶ء مطابق ربیع الاول ۱۴۳۷ھ کے شمارے میں ایک وقیع مضمون لکھا ہے۔ مذکورہ کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شیخ محمد بن عبد الوہاب کی سیرت وحالات کو مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ علیہ (م ۱۹۵۴) نے اپنی کتاب ''محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم مصلح''، میں پیش کیا ہے اور ان کے کام کے متعلق پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالہ پر کتاب لکھی اور وہ بہت مفید ثابت ہوئی۔ محترم مولانا سید رابع حسنی ندوی نے دعوت وعزیمت کا متعلقہ حصہ درج کیا ہے۔ مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں: ''حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک نامور معاصر اور عظیم مصلح، نجد کے ایک ممتاز عالم اور صاحب عزیمت داعی ومصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن التمیمی الحنبلی ہیں۔۔۔

شیخ عبدالوہاب کی دعوت وجدوجہد کا اصل دائرہ توحید خالص کی دعوت وتبلیغ، ردّ شرک، واستیصال رسوم جاہلیت تھا''۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسعود عالم ندوی کی کتاب 'محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح''۔ مولانا رابع حسنی مزید لکھتے ہیں: ''حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے تجدیدی اور بہت مؤثر کام انجام دیا''۔ عبدالوہاب نجدی کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید رابع حسنی کے یہ بیش قیمت خیالات ہیں اور مذکورہ کتاب کا حوالہ، اس کتاب کی قیمت بھی بتا رہا ہے۔

ہندوستان میں ابنائے ندوہ کا یہ کردار رہا ہے کہ تحقیق کے ساتھ ہر اچھے کام اور ہر اچھی تحریک کا ساتھ دیا ہے۔ مذکورہ کتاب بھی ایک ممتاز ندوی عالم کی لکھی ہوئی ہے۔ اس وقت جبکہ پروپیگنڈہ اتنا شدید تھا اور تحقیق کے وسائل محدود تھے، انہوں نے ایسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔ ذیل میں اس کتاب کے متعلقہ اقتباسات دیئے گئے ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے اس کے بیش تر حصہ کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ میرے پیش نظر مکتبہ خدام ملت کراچی کا شائع کردہ نومبر ۱۹۴۹ء کا ایڈیشن ہے۔ کتاب کا انتساب مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہے۔ تقریب اور عرض مؤلف کے علاوہ، کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ صفحات ۲۰۸ ہیں۔ ''۱۹۳۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں (مولانا ابوالحسن علی اور مولانا مسعود عالم) نے یہ ارادہ کیا کہ سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی چلائی ہوئی تحریک تجدید وامامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ ایک نے حضرت سید صاحب کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا۔۔۔۔۔۔۔ دوران بحث وتحیص نجد کی تحریک دعوت وتجدید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں نظر سے گذریں کہ یارائے ضبط نہ رہا، اور اسی بے اختیاری میں عاجز نے زیر ترتیب کتاب کے دو حصے کردیئے۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سیرت اور دعوت سے متعلق یہ صفحے اس مجوزہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں''۔ (تقریب۔ صفحہ ۹۔۱۱)

''بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہوگئی، مسلمان کتاب وسنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنا لیے گئے۔۔۔ تو پھر اسی بے آب وگیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیر وہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا اور خاک عرب کے وہ ذرے جو جہل وشرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اٹھے اور نجد کے چمنستان سے۔۔۔ توحید اور کلمہ حق کی ایسی خوشبو پھیلی، جس نے تمام عالم کو زعفران بنا کر چھوڑا۔ میری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی ذات گرامی سے ہے جنہوں نے اپنی مسلسل اور ان تھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور جہاں تک اس مرد مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی اس نے حق وصداقت کا پیغام پہنچایا''۔ (صفحہ ۱۸۔۱۹)

''ابن عبدالوہاب بچپن ہی سے امر بالمعروف اورنہی عن المنکر کی طرف مائل تھے۔ابھی وہ عیینہ میں فقہ وحدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بدعات ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور جہاں کوئی عمل اصول دین کے خلاف پاتے فوراً نہی عن المنکر کے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے۔۔۔شیخ نے سب سے پہلے اسی زمانے میں استغاثہ کے خلاف آواز بلند کی۔۔۔بصرہ میں معاملہ اور تیز ہوگیا۔نہی عن المنکر بلاخوف کرتے ،جس کی پاداش میں انہیں طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔۔۔حرمیلا واپسی کے بعد انہوں نے بدعات کے استیصال اور توحید واخلاق کے عام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا، دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی۔اور عبادت کی ہر قسم کو صرف اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا۔۔۔غیر اللہ کے آگے سرخم کرنے ،قبروں ،ولیوں سے مدد مانگنے ،نیکوکار بندوں کو معبود ثانی بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔قبرں کی زیارت میں مسنون طریقوں کے خلاف جو بدعتیں رائج ہوگئی تھیں۔ان کے مٹانے کو عملی قدم اٹھایا بس پھر کیا تھا مخالفت کا سیلاب امنڈ آیا۔اعزہ واقربا درپے آزار ہوگئے ،خود باپ کو بھی یہ ادا پسند نہ آئی۔۔۔والد کا انتقال ہوا تو پھر دعوت وتبلیغ میں گرمی پیدا ہوگئی۔علی الاعلان اتباع سنت اور ترک بدعات کا وعظ کہنے لگے۔حرمیلا کے کچھ لوگ متاثر ہوئے اور تحریک کے پر جوش معاون بن گئے ،شیخ کے درس میں حاضر ہونے لگے اور ان کے مواعظ سے مستفید ہوئے۔شیخ کی مشہور تالیف کتاب التوحید اسی دوران میں تالیف ہوئی''۔(صفحات ۲۹۔۳۲)

''انہوں نے پورے نجد کو ایک امیر اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا ارادہ کرلیا۔وہ سمجھتے تھے کہ کسی امیر (حاکم صاحب نفوذ وقوت) کی ہمدردی حاصل کیے بغیر دعوت کو دور ونزدیک جلد از جلد پھیلانا آسان نہیں۔ان خیالات کے پیش نظر انہوں نے عثمان بن معمر امیر عیینہ سے خط وکتابت کی اور امیر کو قبول حق پر آمادہ پاکر خود بھی عیینہ منتقل ہوگئے۔جوہرہ بنت عبداللہ سے شیخ کی شادی ہوئی۔۔۔انہوں نے امیر عیینہ کے سامنے دعوت پیش کی ،توحید کا مضمون واضح کیا اور جلیل القدر مہم میں امداد اور تعاون کی درخواست کی۔شیخ کے یہ الفاظ یادگار اور قابل نقل ہیں۔۔انی أرجو ان أنت قمت بنصر لا اله الا الله أن يظهرك الله تعالى و تملك نجدا و أعرابها۔

افسوس کہ وہ اس پر قائم نہ رہا۔آخر کار یہ نعمت عیینہ سے درعیہ منتقل ہوگئی۔۔قدم قدم پر دشواریاں تھیں ،جاہلوں سے لے کر علماء اور مشائخ تک سب کے سب بدعات کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔۔۔شیخ نے عثمان بن معمر کو نماز باجماعت کے احیاء کی بھی تاکید کی اور متخلفین کے لیے سزائیں تجویز ہوئیں۔شیخ نے عیینہ ہی میں اپنے تبلیغی رسالوں کا سلسلہ شروع کیا جو مرتے دم تک جاری رہا۔۔۔ایک

غیر متوقع حادثہ (رجم کی سزا) نے اطراف وجوانب میں تہلکہ پیدا کر دیا۔ سلیمان بن محمد عزیز الحمیدی نے عثمان کو تہدید آمیز انداز میں لکھا۔ اس نے شیخ کو سلیمان حاکم کے پیام کی اطلاع دی۔ شیخ کے یہ الفاظ سننے کے لائق ہیں۔ ان الذی انا قمت به ودعوت اليه كلمة لا اله الا الله وأركان الاسلام والامر بالمعروف والنهي عن المنكر فان أنت تمسكت به ونصرته فان الله سبحانه يظهرك على أعدائك فلا يزعجك سليمان ولا يفزعك الخ۔ ابن معمر کی حدود سے نکل کر شیخ نے درعیہ کا رخ کیا''۔ (صفحات ۳۳۔۳۸)

''امیر محمد بن سعود کے دل میں شیخ کی محبت گھر کر گئی۔ اس نے ملنے میں پہل کی اور اخلاق وعقیدت سے پذیرائی کی۔ شیخ نے جواب میں اپنی دعوت کے اہم حصوں (کلمہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد) پر مختصر تقریر کی اور اہل نجد کی برائیوں سے آگاہ کیا اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ امیر متأثر ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا: اے شیخ! یہ تو بلا شبہہ اللہ اور اس کے رسول کا دین ہے میں آپ کی امداد اور اطاعت اور مخالفین توحید سے جہاد کے لیے تیار ہوں۔ لیکن دو شرطیں ہیں: (۱) اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ (۲) اہل درعیہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں آپ مجھے اس سے نہ روکیں۔ شیخ نے جواب دیا: پہلی شرط بسر وچشم منظور ہے، ہاتھ ملاؤ: الدم بالدم والهدم بالهدم ۔ رہی دوسری شرط سو ان شاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔ امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا۔ کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ امیر کا بیعت کرنا تھا کہ جوق در جوق لوگ استفادہ اور تجدید ایمان واعمال کے لیے آنے لگے۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لیے اچھی زمین تیار کر دی''۔ (صفحات ۳۹۔۴۲)

''شیخ نے سب سے پہلے درعیہ میں وعظ ودرس کے حلقے قائم کیے۔ خود صبح سے شام تک آنے والوں کو کتاب وسنت کی تعلیم دیتے اور اپنی دعوت، دعوت توحید واخلاص فی عبادۃ اللہ کی اہم اور ضروری چیزیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ شیخ کی جاذب شخصیت اور دعوت کی سچائی نے فوری اثر دکھایا، مجالس وعظ وتذکیر سے یہ فائدہ پہنچا کہ دلوں سے ما ألفينا عليه آباء نا کا زنگ دور ہونے لگا اور رسم ورواج اور خرافات کو وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔۔۔ یہ علم وعمل کے پیاسے راتوں کو کسی حرفت کے ذریعہ قوت لا یموت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور دن کا وقت اللہ کی کتاب اور اس کے برگزیدہ رسول ﷺ کی بتائی باتوں کے سننے کے لیے وقف رہتا۔۔۔ قیام درعیہ کے دوسرے ہی سال امیر

عیینہ نے آ کر بیعت کی اور حدود شرعیہ کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہل حرمیلا نے بھی بیعت کی۔ ادھر امیر محمد بن سعود کی معاونت کا یہ عالم کہ خمس وزکوٰۃ کی تمام رقمیں شیخ کے ہاتھ میں دی جاتیں اور وہ انہیں بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ امیر ابن سعود اور ان کے جانشین عبدالعزیز بن محمد بن سعود شیخ کی اجازت کے بغیر ادنی تصرف روا نہیں رکھتے۔ بایں ہمہ شیخ کی للّٰہیت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے پاس ایک حبہ بھی نہیں رکھتے اور جو کچھ آتا سب اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔۔۔ شیخ نے اپنی دعوت کا حلقہ وسیع کیا اور دور دور کے شہروں کے علماء، امراء اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے اور انہیں اپنی دعوت کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے لگے۔ کسی نے شیخ کی دعوت کا مذاق اڑایا۔ کسی نے انہیں جاہل کہا، کسی نے جادوگر اور کسی نے ایسی تہمتیں لگائیں جن سے وہ پاک تھے۔۔۔ آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والوں اور اس کی حمایت کرنے والوں میں سب سے ممتاز صنعاء (یمن) کے مجتہد النظر عالم امیر محمد بن اسماعیل تھے جنہوں نے شیخ کی دعوت پا کر اپنا مشہور وجد آفریں قصیدہ لکھا''۔ (صفحات ۴۲۔۴۵)

''ہم اسے شیخ الاسلام کی دعوت کی انتہائی کامیابی سمجھتے ہیں کہ ان کی تعلیمات اور ان کے پیروان اوہام سے بالکل الگ تھلگ اور خطرات سے بال بال بچے رہے۔ بعض اہل علم نے افترا پردازیاں کیں، پر ان کے ماننے والے اور جانشین اپنے عقیدوں میں اتنے صاف اور واضح تھے کہ ان کی ایک نہ چلی اور نجد کے موحد پر کوششوں کے باوجود ان کی ہر طرح کی تصنیفات اور رسالوں سے کوئی ایسا الزام نہ تراشا جا سکا۔ ان کی کتابیں کھلی ہوئی اور دو دو چار کے انداز میں اپنے لکھنے والے کی جرأت وصداقت کی شہادت دیتی ہیں۔ پوری کتاب التوحید پڑھ جاؤ کوئی پیچیدگی، تصوف، توہم، دوراز کار باتیں، منطقیانہ استدلال، یونانی کج بحثی، ان میں کسی چیز کا ادنی شائبہ بھی نہ ملے گا''۔ (صفحہ ۴۹)

''محمد بن عبدالوہاب ایک ٹھیٹھ عالم تھے، پر ان کی نگاہیں بڑی دوررس تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دعوت کے ثمرات دیکھے، دینی ثمرات بھی اور دنیوی پھل پھول بھی۔ ان کی زندگی میں نجد کا پورا علاقہ مفتوح ہو چکا تھا۔ امیر محمد بن سعود اور ان کے جانشین امیر عبدالعزیز ان کے مشوروں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور نہیں کرنا چاہتے۔ سارا مال غنیمت ان کے قدموں پر لا کر ڈال دیا جاتا، لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنے کام سے کام رکھا جب تک ضرورت رہی دخل دیتے رہے، جوں ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب دعوت کی بنیادیں استوار ہو گئی ہیں، اپنے کو ملکی انتظامات اور مال غنیمت کے نظم ونسق سے یکسر الگ کر لیا۔ شیخ کی اس بے نفسی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی اولاد بھی دنیوی جاہ وحشم سے الگ دین کی خدمت میں مصروف رہی۔ کبھی ان کی اولاد تخت وتاج کے لیے آل سعود سے دست وگریباں نہیں

ہوئی۔شیخ کی اولاد وا حفاد اب آل الشیخ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ شیخ کی خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے اپنے ایسے جانشین چھوڑے جو بالکل انہی کے مطابق سنت رسول کے تتبع اور تبلیغ وتدریس میں مشغول رہے۔ مؤرخ ابن بشر کہتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ان (کے بیٹوں، حسین، عبداللہ، علی، ابراہیم) کے درس میں طلبہ کا اتنا ہجوم دیکھا کہ اگر کسی سے بیان کیا جائے تو شاید اسے یقین نہ آئے۔ وہ کہتا ہے 'ان میں سے ہر ایک کے گھر کے پاس ایک مدرسہ تھا، جس میں پردیسی طالب علم رہا کرتے، اور ان کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے، یہ لوگ شب و روز تحصیل علم میں مصروف رہتے''۔ (صفحات ۴۹۔۵۱)

''سعود بن عبدالعزیز نے شہر کربلا پر حملہ کیا تا کہ شیعی قبیلہ خزاعل کے وہابی قافلے پر حملہ کا انتقام لیا جا سکے۔ (فلبی) مسلمانوں نے کربلا پر دھاوا بول دیا۔ اس کی دیواروں پر چڑھ گئے اور زبردستی (عنوۃ) داخل ہو گئے اور اکثر باشندوں کو گھروں اور بازاروں میں تہ تیغ کیا۔ اور اس قبہ کو جوان کے خیال کے مطابق حسین کی قبر پر بنایا گیا تھا، ہدم کر دیا۔ قبہ اور اس کے آس پاس اور چڑھاوے کی ساری چیزیں لے لیں۔ قبہ زمرد، یاقوت اور جواہر سے آراستہ تھا، اور اس کے علاوہ شہر میں جو کچھ مال و متاع (ہتھیار، لباس، سونا، چاندی، قیمتی مصاحف اور بے شمار چیزیں) ملا، سب لے لیا۔ (عنوان المجد)''۔ (صفحات ۷۶۔۷۷)

''سعود بن عبدالعزیز ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ باشندوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ سعود نے باشندوں کو امان دی اور صدقات وعطیات دل کھول کر تقسیم کیے۔ جب سعود اور مسلمان طواف اور سعی سے فارغ ہوئے تو اہل نواحی قبوں اور شرکیہ مشاہد کے انہدام پر مامور کیے گئے۔ مکہ کے ہر حصے میں اس قسم کی چیزیں بکثرت تھیں۔ سعود نے کوئی بیس دن قیام کیا۔ اور اس دوران مسلمان ان قبوں کو گراتے رہے تا آنکہ مکہ مکرمہ کے تمام مشاہد اور قبے زمین کے برابر کر دیئے گئے۔ کعبہ کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ قبے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے۔ (مذکور حوالے فلبی اور عنوان)۔۔۔ ایک پادری کا بیان ہے۔ 'حرم کی تقدیس کے باعث باشندوں کو ادنیٰ گزند نہیں پہنچا۔ اور اہل نجد کے صاحب امر ہونے کے بعد مسجدیں اس طرح آباد ہوئیں کہ بلد امین میں اطاعت و زہد کی یہ مثال عہد نبوت کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی تھی'۔ ایک اور یورپی لکھتا ہے: 'مقدس شہر میں داخل ہونے پر فوج نے کوئی ناروا حرکت نہیں کی۔ تمام دکانیں دوسرے روز کھل گئیں اور فوجیوں نے ضرورت کی تمام چیزیں نقد قیمت دے کر خریدیں'۔ ابن بشر لکھتا ہے کہ 'اور مکہ مکرمہ میں اب کوئی منکر چیز (تمباکو نوشی، ترک صلوٰۃ اور غیر اللہ کی قسم کھانا) نہیں دکھائی پڑتی'۔ شریف مکہ نے ان سب چیزوں کے ترک کر دینے کا عہد کیا، جو بعد کو لوگوں نے پیدا کر لی ہیں۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا،

قبروں پر قبوں کی تعمیر، تصویروں اور نمائشی چیزوں کی بہتات، چوکھٹوں کو بوسہ دینا، غیر اللہ کے لیے تذلل اور خضوع۔۔۔ برک ہارٹ نے بھی نمازوں پر سختی اور سزاؤں کا ذکر کیا ہے''۔ (صفحات ۸۰۔۹۱)

''برک ہارٹ کہتا ہے: 'غالباً پیغمبر عرب کے بعد پہلی بار ملک میں ایسا امن وامان قائم ہوا، کہ بدوؤں کو اپنے مال ومتاع اور مویشیوں کی طرف سے بے فکر ہوکر آرام سے سونے کا موقع ملا'۔ اسی طرح رعب کا یہ عالم تھا' کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے قبیلہ کے سردار کو یکہ وتنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا''۔ (صفحہ ۱۰۱)

''اس وقت کے نجدیوں کے اخلاق اور علم کا اندازہ کرنے کے لیے معاصر اور عینی شاہد جبرتی کی یہ رائے سننے کے لائق ہے۔ جب عبداللہ بن سعود اور طوسون مصری کے مابین صلح ہوگئی تو عبداللہ نے قاہرہ دو قاصد بھیجے۔ 'ان دونوں قاصدوں نے امام احمد بن حنبل کے اہل مذہب اور فقہ حنبلی کی کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ ان دونوں نے تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابیں (جیسے خازن، کشاف، بغوی، صحاح ستہ وغیرہ) خریدیں۔ میں ان دونوں سے دومرتبہ ملا۔ میں نے ان میں اُنس، فصاحت زبان، وسعت نظر اور معلومات کی فراوانی پائی اور ان کی عاجزی، حسن خلق، ادب، تفقہ اور فقہی مسائل واختلافات پر عبور کی تو تعریف ہی نہیں ہوسکتی۔ ان میں ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا نام عبدالعزیز ہے، اور دوسرا ہر اعتبار سے افضل ہے'۔ ایک حریف مصری فوجی کی زبانی جبرتی نجدیوں کے بارے میں لکھتا ہے 'یہ قوم (نجدی) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور ایک امام کے پیچھے خشوع وخضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔ اگر جنگ کے دوران میں کہیں نماز کا وقت آ گیا، تو مؤذن اذان دیتا ہے اور سب نماز خوف پڑھتے ہیں۔ ایک جماعت جنگ کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ پھر دوسرا گروہ نماز کے لیے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور ہماری فوج حیرت سے منھ تاکتی ہے، ان بے چاروں نے دیکھنا تو درکنار سنا بھی نہیں'۔ نجدی وہابیوں کے بارے میں ایک عینی اسپینی شاہد عرف علی بے کا بیان سنیے: 'جب تک وہ یہ نہ جان لیں کہ فلاں چیز دشمن یا مشرک کی ہے، اسے ہاتھ نہیں لگاتے اور زبردستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ تمام چیزیں قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اس طرح ہر خدمت کی اجرت ادا کرتے ہیں، اپنے سردار کے اندھے اطاعت شعار ہونے کی وجہ سے اس کے احکام کی تعمیل میں ہر مشقت برداشت کرنے کو تیار رہتے ہیں'۔ محقق سیاح برک ہارٹ کی کتابیں اس کی صحت بیان اور دقت نظر کی شاہد ہیں، لکھتا ہے: ۔'وہابی اقدام کی تہہ میں بری رسموں کے ختم کرنے کی زبردست مخلصانہ خواہش کام کر رہی تھی۔ غدار سے غدار دشمنوں سے بھی انھوں نے وعدہ شکنی نہ کی'۔'' (صفحات ۱۰۶۔۱۲۷)

''ان کی تصنیفات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر یونان اور یونانی علوم کی ہلکی سی پر چھائیں بھی نہیں پڑی۔ شیخ کا طریقہ بالکل قرآنی ہے اور ان کی دلیلیں جزء وکل قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کی اصطلاحات بھی ناپید ہیں۔ اس نے اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کرڈالیں۔ اسلامی ہند کے مجددین نے یہ بڑی غلطی کی کہ وہ اس افیون کا استعمال کراتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان آج تک اس مایا جال سے نہ نکل سکے لیکن شیخ الاسلام کے صحیح علاج اور اس افیون سے مکمل پرہیز کے باعث نجد اور نواح نجد کے مسلمان اس گورکھ دھندے سے ہمیشہ ہمیش کے لیے نکل گئے۔۔۔ان کی تحریروں میں ایک دوسری انمول چیز یہ ہے کہ ان کی ہر سطر تاثیر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اس دینی تڑپ کا اثر ہے جس نے انہیں عمر بھر بے قرار رکھا۔ آخر ان میں کوئی چیز تو تھی جس نے آن کی آن میں نجد اور اس کے نواح کی کایا پلٹ کر دی۔ جہاں تک شیخ کے طرز بیان کا تعلق ہے اس میں کوئی الجھاؤ نہیں، البتہ زبان انشاء امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور شاہ ولی اللہ کی طرح بلند نہیں''۔ (صفحات ۱۲۹۔۱۳۰)

شیخ کا فقہی مسلک :

''عقائد واعمال ہر چیز میں سلف کی پیروی ان کے دل سے لگ گئی تھی۔ فروع فقہ میں وہ امام اہل سنت احمد بن حنبل کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ لیکن حنابلہ کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جانے پر انہیں کوئی طاقت اس حدیث پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے اقوال سے وہ بسا اوقات استدلال کرتے تھے۔ لیکن ان کی تقلید کا پھندا بھی شیخ نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے وہ حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے بھی دوسروں کو اس کی پیروی پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ شافعی کو شافعی اور حنفی کو حنفی بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ بدعات اور بے ہودہ رسمیں کسی امام نے روا نہیں رکھیں۔ شیخ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" ونحن ایضا فی الفروع علی مذهب الامام أحمد بن حنبل ، ولا ننکر علی من قلد احد الاربعة دون الغیر لعدم ضبط مذاهب الغیر کالرافضة۔ ولا نستحق اجتهاد المطلق ولاأحد لدینا یدعیه الا أننا فی بعض المسائل اذا صح لنا نص جلی من کتاب الله وسنة غیر منصوص ولا مخصص ولا معارض بأقوی منه وقال به أحد الأئمة الأربعة أخذنا به وترکنا المذهب کارث الجد والاخوة وان خالف مذهب الحنابلة ۔'' (صفحات ۱۴۰۔۱۴۲)

عقائد:

''عقائد کے باب میں وہ سلف کے مسلک پر ہیں۔قرآن کریم اور صحیح حدیثوں میں اللہ تعالی کی جو صفتیں آئی ہیں، انہیں ہو بہو تسلیم کرنا اور کیفیت کی نفی کے ساتھ ان کے ظاہر پر ایمان لانا، یہی سلف کا مسلک ہے۔صفات کا مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ایک جماعت تشبہ اور تمثیل کے خوف سے صفات ہی کا انکار کر بیٹھی۔ یہ گویا اللہ کو معطل کر دینا ہوا۔ دوسری جماعت صفات کی قائل ہوئی تو تشبہ اور تکیف کی حد تک آ گئی یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔اللہ تعالی کی ذات جسمیت سے منزہ ہے۔ متکلمین اشاعرہ نے اس تعطل اور تشبہ سے بچنے کے لیے تاویل شروع کردی۔سلف کا مسلک اس تکیف و تعطیل اور تاویل سے الگ ہے۔ بقول علامہ ابن تیمیہ' ائمہ سلف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ کو تحریف، تعطیل، تکیف، تمثیل کا ادنی شائبہ آئے بغیر ان صفتوں کے ساتھ متصف کریں، جن کے ساتھ خود اس نے اپنے کو اور اس کے رسول کریمؐ نے متصف کیا ہے تو ان صفات کی نفی جائز نہیں، جن سے اس نے اپنے کو متصف کیا ہے، اور نہ ان صفات کو مخلوق کی صفتوں کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے بلکہ اس کی ذات ان چیزوں سے منزہ ہے اس کا مثل کوئی نہیں۔نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں۔تو سلف کا مذہب دو مذہبوں کے بین بین اور دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔یعنی صفات کا اثبات اور مخلوقات کے ساتھ مماثلت کی نفی۔امام دار الہجرۃ مالک بن انس کا مشہور مقولہ مسلک سلف کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔' الاستواء غير مجهول والكيف غير معقول والايمان به واجب والسؤال عنه بدعة۔ یہ سلف کا مسلک صرف حنابلہ یا ابن تیمیہ اور شیخ عبدالوہاب کا نہیں بلکہ تمام ائمہ اسلام کا مسلک یہی رہا ہے 'تشبیہ اور تمثیل کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچنا' (الامساك عن التأويل مطلقا مع نفي التشبيه والتجسيم) تمام ائمہ کا مسلک رہا ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد وغیرہم سب اسی مسلک پر گامزن رہے ہیں۔خود امام ابوالحسن اشعری سے رجوع ثابت ہے۔تمام صحابہ اور تابعین کا تو یہ مسلک تھا ہی، تاویل کا دروازہ تو عقلیت کی گرم بازاری کے بعد کھلا۔متاخرین اشاعرہ اور علماء (متاخرین) کا مسلک تاویل کا رہا ہے۔ مدرسوں میں عقائد کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ یہی تاویل کا مسلک ہے۔ آیات صفات کے باب میں سلف کا مسلک مشہور ہے۔شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب بھی سلف کے عقیدے پر سختی پر قائم رہے''۔(صفحات ۱۴۲۔۱۴۶)

توحید اور اس کے لوازم:

''شیخ الاسلام نے اپنی تمام کتابوں اور رسائل میں توحید پر بہت زور دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ

ان تصنیفات میں صرف توحید ہی توحید ہے۔ان کی دعوت توحید کی تھی۔شعار کلمہ لا الہ الا اللہ تھا۔اخلاص توحید کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اقوال واعمال سے پرہیز کیا جائے جس میں غیر اللہ کی شرکت کا ادنی شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو۔شیخ توحید سے دور اور شرک سے قریب کرنے والی چیزوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

(۱) مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا۔دعائے غیر اللہ شائبہ شرک سے خالی نہیں۔اس دعاء میں عبادت کی جھلک آتی ہے۔داعی کی نیت اور مدعو کے مرتبہ سے بالکل بحث نہیں۔ایک مخلوق دوسری مخلوق کو مصیبتوں میں پکارے،اس سے دفع ضرر اور جلب خیر کی درخواست کرے، یہ توحید کے سراسر خلاف ہے۔اگر کوئی جاہل ہے تو شیخ کے پیرو اس کو سیدھی راہ بتلائیں گے۔اگر کوئی شریعت کا حکم جاننے کے بعد بھی دفع ضرر یا جلب خیر کے لیے غیر اللہ کو یاد کرتا ہے اور پکارتا ہے تو پھر وہ اسے مشرک سمجھتے ہیں۔

(۲) استغاثہ:۔غیر اللہ سے فریاد چاہنا اس کا حکم بھی دعائے غیر اللہ کا ہے۔زندہ یا مردہ، کسی غیر اللہ سے فریاد چاہنا قطعاً حرام ہے،اور اسلامی توحید کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) توسل :۔لفظ توسل تین معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔(الف) رسول اللہ کریمؐ کی اطاعت کا وسیلہ،تو یہ فرض ہے اس کے بغیر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔(ب) رسول اللہؐ کی دعا وشفاعت کا وسیلہ، یہ رسول اللہؐ کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت کے دن اس کا موقع ہوگا، جب خلقت رسول اللہ کا وسیلہ ڈھونڈھے گی۔(ج) تیسرا وہ توسل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیاء وصالحین کا واسطہ دلایا جاتا ہے،تو یہ صحابہ نے رسول کریم کی زندگی میں کیا نہ وفات کے بعد نہ استغفار وغیرہ کے موقع پر نہ قبر پر نہ قبر سے ہٹ کر کسی موقع پر صحابہ سے اس قسم کا غیر مشروع توسل منقول نہیں،جس میں اللہ تعالیٰ کو گویا رسول یا ولی کی ذات کی قسم دی جاتی ہے، ادعیہ ماثورہ میں بھی کہیں اس توسل کا پتہ نہیں چلتا۔توسل کی یہی تین صورتیں ہیں جن میں سے پہلی صورت (یعنی رسول اللہؐ پر ایمان اور ان کی اطاعت کا وسیلہ پکڑنا) ہمیشہ مشروع ہے دوسری صورت رسول اللہؐ کی دعا اور شفاعت کو (ذات کو نہیں) وسیلہ بنانا،تو یہ رسول اللہ کی زندگی میں بلاشبہ نافع اور مطلوب تھا،توسل کے ان دونوں معنوں کا منکر کافر اور مرتد ہے(ومن أنكر التوسل بأحد هذين فهو منكر و مرتد) جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے لیکن رسول اللہؐ کے بعد یہ دوسری صورت بھی متعذر رہ گئی۔قبروں پر سلام اور اہل قبر سے مخاطب ہوکر السلام علیکم کہنا منقول ہے لیکن مردہ یا غائب سے دعا کی درخواست کرنا بدعت ہے۔اب رہی تیسری صورت جس میں انبیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو انبیاء اور صالحین کے نام کی قسم دی جائے،تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔حنابلہ کے نزدیک، صحیح روایت میں،مکروہ تحریمی ہے۔امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہاء

حنفیہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔انبیاء،اولیاء یا مقامات مقدسہ کسی کے حق کا واسطہ لاکر دعا مانگنا حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔یہی امام ابن تیمیہ کا مسلک ہے اوراسی پر شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اوران کے متبعین کا عمل ہے۔متقدمین محقق علماء میں شیخ عزالدین بن عبدالسلام صرف رسول کریمؐ کی ذات اقدس سے توسل کو جائز قرار دیتے ہیں۔متأخرین میں شوکانی توسل بالنبی کو جائز رکھتے ہیں۔

(۴)استعاذہ:۔توحید کا اقتضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی،اس کے اسماء اور صفات کے سوا کسی مخلوق کی پناہ بھی نہ ڈھونڈی جائے۔

(۵)الحلف بغیر اللہ:۔غیر اللہ کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں،بلکہ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ترمذی کی روایت ہے۔(من حلف بغير الله فقد أشرك)امام اعظم کے نزدیک اللہ کے سوا غیر اللہ کی قسم کھانا یا اس کی دہائی دینا قطعاً ممنوع ہے۔دعائے غیر اللہ،استغاثہ لغیر اللہ،التوسل بالانبیاء والصالحین،استعاذہ اور حلف بغیر اللہ،یہ سب کی سب ایک قسم کی چیزیں ہیں۔

(۶)زیارت القبور:۔قبروں کی زیارت مشروع ہونے میں کوئی شک نہیں،بشرطیکہ زیارت کی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔مسلمانوں کے لیے انبیاء،صالحین،عام مسلمانوں،بلکہ غیر مسلموں کی قبروں کی زیارت بھی جائز ہے،اس کے لیے جو عبرت اور نصیحت حاصل کرنا چاہے اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سنت ہے،اس کے لیے جو اہل قبر کے لیے دعا کرنا چاہے۔محمد بن عبدالوہاب قبروں کی زیارت کے منکر نہیں،البتہ ان بدعات کے سخت مخالف ہیں،جو قبروں کے پاس روا رکھی جاتی ہیں۔وہ قبروں سے مرادیں مانگنے والوں،دعا کرانے والوں اور شفاعت چاہنے والوں کو روکتے ہیں اور آج کل قبروں کی زیارت نہیں ہوتی بلکہ بدعت فروشی کی دکانیں گرم ہوتی ہیں۔صاحب قبر سے دعا مانگنا،اس کے واسطے سے دعا مانگنا،ان میں سے کوئی چیز جائز نہیں اور مؤحدین انہی چیزوں سے روکتے ہیں۔قبروں کو مسجد بنانے سے حدیثوں میں بار بار منع کیا گیا ہے۔اس باب میں بے شمار صحیح مشہور حدیثیں ہیں اوراسی بنا پر محمد عبدالوہاب کے ماننے والوں نے قبوں کے گرانے میں کوئی پس وپیش نہیں کیا۔ایک چیز ناروا ہے۔فرمان شریعت کے خلاف قبروں کو اوثان(بتوں)کی حیثیت دے دی گئی ہے۔یہ ایک منکر ہے،اگر طاقت ہو تو اس منکر کے مٹانے میں دریغ نہیں ہونا چاہیے۔محمد بن عبدالوہاب کے جانشین پہلے فرماں روا نہیں ہیں جنہوں نے قبوں کے انہدام پر توجہ کی ہو،بلکہ یہ امام شافعی ہی کے زمانے سے چلا آتا ہے۔امام شافعی نے کتاب الام میں ذکر کیا ہے کہ حکام قبروں کو ہدم کرتے ہیں اور فقہاء ان پر اعتراض نہیں کرتے۔نوویؒ نے شرح مسلم میں بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے''۔(صفحات ۱۴۶۔۱۵۵)

تکفیر و قتال مسلمین :

''شیخ الاسلام اور ان کے ماننے والوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہل قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے قتال جائز سمجھتے ہیں۔یمن کے نامور عالم اور محقق قاضی محمد بن شوکانی اہل نجد کے مسلک پر اعتراض کرتے ہیں، کہتے ہیں 'لیکن ان کا خیال ہے جو امیر نجد کے دائرہ اطاعت سے باہر ہے، وہ نماز باجماعت ترک کرنے والوں سے قتال کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن تارک صلوٰۃ کی تکفیر جائز رکھتے ہیں'۔ ہم یہاں اہل نجد کی زبان میں ان کا مسلک بیان کر دیتے ہیں، جو کوئی نیا مسلک نہیں ہے، بلکہ حنابلہ اور ظواہر کا مشہور مسلک ہے۔شیخ الاسلام کے شاگرد احمد بن ناصر بن عثمان معمری نجدی یوں وضاحت کرتے ہیں 'جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے کے بعد بھی شرک پر قائم ہے، مردوں سے دعائیں مانگتا ہے ان سے ضرورتوں کے پورا کرنے اور مصیبتوں کے دور کرنے کی درخواست کرتا ہے تو وہ کافر و مشرک ہے، اس کا خون اور مال حلال ہے، اگر چہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے، نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے اور اپنے کو مسلمان بھی کہتا ہے'۔ابن معمر نجدی نے سستی سے نماز ترک کرنے والوں سے بھی قتال کو جائز رکھا ہے۔زہری اور امام ابوحنیفہ کے علاوہ تمام ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے۔حنابلہ کا یہ مشہور مسلک ہے اور اسی پر اہل نجد عامل ہیں۔تارک صلوٰۃ کا کفر ان کے نزدیک محقق ہے۔تارک صلوٰۃ کے بعد قبر پرستوں کا مسئلہ آتا ہے۔شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ان صنم پرستوں کی تکفیر کی جو اولیاء اور نیکوکار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں، جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریق حق کی وضاحت کے بعد شرک کا ارتکاب کیا اور اللہ کا شریک ٹھہرایا، اور پھر انہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے ان سے قتال کیا اور ان کا خون بہایا اور ان کا مال لوٹا، اس حال میں کہ کتاب وسنت اور اجماع سب کی شہادتیں ان کی تائید میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ عمومی تکفیر کی اہل نجد تردید کرتے ہیں لیکن اتمام حجت اور تبلیغ کے بعد تکفیر اور قتال کے قائل نظر آتے ہیں۔قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو یہ کفر عملی نہیں سمجھتے، جیسا کہ عام طور پر کفر عمل اور کفر اعتقاد کے درمیان فرق کیا جاتا ہے''۔(صفحات ۱۶۷۔۱۷۲)

نوٹ :

اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ مذکورہ کتاب 'محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح' کی تلخیص پیش کرتے وقت معانی اور مفاہیم جوں کے توں منتقل ہوں۔الفاظ بھی مصنف کے ہیں، کوشش کی ہے کہ اپنے الفاظ کی آمیزش نہ ہو۔متعلقہ حصہ کی تلخیص کے ساتھ صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے تاکہ قاری کے لیے کتاب کے متعلقہ حصہ کو تلاش کرنا آسان ہو۔

اسلامی ادب سے کیا مراد ہے؟

(یہ تحریر جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کی جانب سے منعقد ایک ادبی محفل ۱۹۶۷ء میں پڑھی گئی تھی)

ظفر احمد اثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

محترم حاضرین!

انسان کے اندر بہت سی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جن کا استعمال وہ مختلف طریقوں سے کرتا ہے، چاہے وہ طریقہ صحیح ہو یا غلط، ان صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت نطق کی صلاحیت ہے اور دوسری تحریر کی صلاحیت ہے۔ آپ میں سے ہر شخص یہ جانتا ہوگا کہ آج انسان ان دونوں صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں کتنا آگے بڑھ چکا ہے، ان ہی صلاحیتوں سے وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ صلاحیتیں صحیح سمت میں استعمال ہو رہی ہیں یا غلط سمت میں۔ آج سے چودہ سو سال قبل جبکہ یہ صلاحیتیں اتنی نہیں ابھری تھیں اور اس طریقے سے نہیں ابھری تھیں کہ یہ انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر محیط ہو، باوجود اس کے یہ صلاحیتیں ہر زمانے میں پھلتی پھولتی رہیں اور ترقی کی منزلیں طے کرتی رہیں، لیکن ان کو اپنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ مختلف رہا ہے۔ آج یہ صلاحیت اتنی ابھر کر سامنے آ گئی ہے کہ اس سے انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ انسان ان صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اپنی زندگی سنوارنے کے بہ جائے اس کے تخریبی استعمال سے خود اپنی اصل صورت مسخ کر رہا ہے، فحش لٹریچر، فحش گانے اور فحش رسائل کے روز افزوں بڑھتے سیلاب میں انسانی قدریں تیزی سے گم ہوتی جا رہی ہیں۔ انسان خود حیران ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔

محترم حاضرین!

ادب ایسا میدان ہے جس میں انسان کود پڑتا ہے اور اپنا کرتب دکھلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب نام ہے اپنی باتوں کو لوگوں کے سامنے بہترین اسلوب میں پیش کرنے کا۔ یہ ایک ایسا ہتھیار جس سے انسانی زندگی میں ترقی لائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جسے اپنا کر قوموں کی

زندگی بگاڑی جاسکتی ہے، انہیں بامِ عروج پر لے جانے کے بجائے انحطاط کے گڈھے میں گرایا جاسکتا ہے۔ آج ادب محض حسن کاری یا جذبات نگاری کا نام نہیں رہ گیا ہے بلکہ ادب ایک مقصد کی خاطر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ادب کا مطلب لوگوں کے نزدیک یہ ہو چکا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو اس طرح ابھارا جائے کہ ان کی پستی بلندی نظر آنے لگے اور ان کے اندر ایک کشمکش ذہنی پیدا ہو جائے جو افراد کی زندگی کو تہ و بالا کر دے اور قوموں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دے۔ ایسے ادب کی ترقی اور ترویج سے انسان کے سامنے مختلف مسائل کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ادب ایسا انقلاب لانا چاہتا ہے کہ انسانی جذبات صحیح رخ کے بجائے غلط رخ اختیار کر لیں، اس قسم کے ادبی رجحانات سے ادیبوں اور شاعروں کو عریاں نویسی اور فحش نگاری اور اباحیت پسندی کی طرف مائل کر کے ملک کی ادبی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ لوگوں کا ذوق اسی سیل میں بہہ گیا ہے، شعر و ادب کا یہ رجحان ملک کے طلبہ اور نوجوان نسل پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے، اس کا لازمی نتیجہ جو ہونا چاہیے ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے، بظاہر یہ ترقی لوگوں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی ہے اور سہل پسند اور تفریح پسند طبیعتوں کو لبھانے والی ہے، لیکن اگر ہم ذرا سا بھی غور و تامل سے کام لیں اور مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانک سکیں تو ہمیں ایک نہایت ہی ہولناک منظر دکھائی دے گا۔

حاضرین کرام!

وہ ادب جسے ہم ترقی پسند ادب کے نام سے پکارتے ہیں وہ خاص طور سے ہمارے ملک میں ترقی پا رہا ہے۔ اس کا فروغ انسانی زندگی کے لیے زوال کا سبب ہے، ہماری زبان کا ادب مختلف ادوار سے گزرا ہے، ایک وقت تو وہ ادب تھا جو "رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتا تھا" پھر گل و بلبل اور شاہد و ساقی کا دور رہا، اشتراکی ادب کو فروغ دینے کی جدوجہد جاری ہے، اس کی بنیاد وہ نظریۂ حیات ہے جو خدا کا منکر اور مذہب کو افیون کی گولی سمجھتا ہے۔ یہ ادب انسان کی اخلاقی حیثیت کو تسلیم کر کے انکار کرتا ہے اور اسے باشعور حیوان بنانا چاہتا تھا، جس کی زندگی کا حاصل صرف جنسی خواہشات اور شکم کے مطالبات ہیں، ہر سوچنے والا انسان اس صورت حال کو دیکھ کر گھبرا جائے گا، اور یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ ادب کی ترقی نہیں ہے، اس سے انسانی زندگی میں کوئی بہتر تغیر نہیں آسکتا بلکہ انسانی زندگی انحطاط پذیر ہوگی۔

حضرات!

یہ ہے ترقی پسند ادب۔ یہ ادب فکر و فن کا جو انقلاب لانا چاہتا ہے وہ صالح و صحتمند انقلاب نہیں کہا جاسکتا۔ لہٰذا اس سے آپ کو بھی اتفاق نہ ہوگا۔ میرا موضوع تھا 'اسلامی ادب سے کیا مراد ہے'۔ لیکن میں

نے اس پر بحث کرنے کے بجائے ترقی پسند ادب پر بحث شروع کردی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کے ذکر کرنے کے سلسلہ میں فطری طور سے روایتی اور تاریخی ادب اور ترقی پسند یا جدید ادب کا تذکرہ ناگزیر ہے اور جس کا انسانی زندگی سے گہرا رشتہ ہے، اس کی ترتیب وتہذیب سے انسانی زندگی کو بنایا بگاڑا جا سکتا ہے، اگر ادب کی بنیاد بے یقینی، خدا فراموشی اور اخلاق ناشناسی پر ہوگی تو زندگی پر اس کے اثرات ویسے ہی مرتب ہوں گے۔ اسلامی ادب جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے ایسا ادب ہوسکتا ہے جو اسلامی نظریات کا حامل ہو، ادب وشعر یا دوسرے اصناف سخن کو اسلام کے معیار حسن وقبح پر جانچے اور پرکھے اور اصناف سخن کی ہیئت ومواد کو خیر وصلاح اور صحت مندی کے عناصر سے سنوارے اور بنائے۔

محترم حاضرین!

یہ ترقی پسند اور بے مقصد ادب اپنے نظریہ کو نافذ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے، قریب ہے کہ ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو، قریب ہے کہ ان خیالات وتاثرات کی حکمرانی ہو، یہ ان کا مسلم نظریہ ہے۔ اب خود بخود یہ سوال آپ کے ذہنوں میں حاصل آ گیا ہوگا کہ آخر اسلامی ادب کیا ہے، جس کے ذریعہ انسان کی صحیح رہنمائی ہوگی، جس کے ذریعہ انسان کے نظریات وخیالات میں انقلاب برپا ہوگا اور جس کے ذریعہ ایک پرامن اور صحت مند ماحول تیار ہوگا۔

اسلامی ادب ایک وسیع میدان ہے جس میں رنگہا رنگ کے خوبصورت پھول نظر آتے ہیں، جس کی خوشبو انسانی زندگی میں ہنر پیدا کرنے والی، جس کی شاخیں آسمان سے جالگتی ہوں، پوری دنیا اس کی خوشبو سے متمتع ہوتی ہوں اور اس سے انسانی زندگی کی تلخی مٹتی ہو اور اس میں ایسا انقلاب آجائے جس کے چہار جانب عطر بیز پرامن ہوائیں ہوں، ہر شخص ایک ایسی فضا میں سانس لے کہ اسے گھٹن نہ محسوس ہو، انسان کے فطری جذبات کی تسکین اس انداز سے ہو کہ اس کا ضمیر ہر آن زندہ ہو، وہ محبت بھی کرے اور حسن سے محظوظ بھی ہو، لیکن اس کی حس بیدار رہے اور اس کی زندگی اخلاق کی تابانی سے روشن ہو۔ اسلامی ادب ذہنی گھٹن کی ضد ہے۔

مشاہیر کے خطوط
مولانا جلیل احسن ندویؒ کے نام-۱

ترتیب وتوضیح: **رضوان احمد فلاحی**، لندن
ای میل:rizwanfalahi@hotmail.com

اگست ۲۰۰۵ میں راقم کو جامعۃ الفلاح میں استادگرامی مولانا جلیل احسن ندوی (م۱۹۸۱) کے نام بعض مشاہیر کے خطوط دیکھنے کا اتفاق ہوا جن میں مولانا اختر احسن اصلاحی (م۱۹۵۸)، مولانا امین احسن اصلاحی (م۱۹۹۷)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م۱۹۷۹)، مولانا مسعود عالم ندوی (م۱۹۵۴)، مولانا محمد ناظم ندوی (م۲۰۰۰)، مولانا عبدالماجد دریابادی (م۱۹۷۷) اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (م۱۹۹۹) نیز دیگر مشاہیر کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ انہیں پڑھ کر خیال گزرا کہ ان میں سے بعض خطوط ایسے ہیں جن کی مناسب توضیحی حواشی کے ساتھ اشاعت ایک علمی خدمت ہوگی۔ چناں چہ میں نے ذمہ داروں کی اجازت سے ان خطوط کی نقول اپنے آرکائیوز میں اس نیت سے محفوظ کرلی۔ اس طویل عرصے میں ان پر کام کرنے کا کئی مرتبہ قصد کیا، لیکن بعض موانع کی وجہ سے ارادہ حدِ ارادہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ 'جریدہ حیات نو' میں 'نایاب خطوط' کی اشاعت کے اہتمام نے اس خیال کو مہمیز بخشی جسے عملی شکل دینے کا بفضل الٰہی اب موقع مل رہا ہے۔

مکاتیب مولانا امین احسن اصلاحی

اس ذخیرۂ مکاتیب میں سب سے زیادہ خطوط مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب کے تحریر کردہ ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ ہے۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر سے شائع ہونے والے سہ ماہی مجلّے 'نظام القرآن' (شمارہ۳، جلد۵، رجب-رمضان ۱۴۲۵/ستمبر-نومبر۲۰۰۴) میں وہ خطوط جزوی حاشیہ آرائی کے ساتھ شائع ہوچکے ہیں۔ (تاہم ان کے گراں قدر مشمولات کی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ توضیحی حواشی وتعلیقات کے ساتھ مدون کرکے ان کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام ہو۔) ان کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی

صاحب کے تحریر کردہ خطوط ہیں جن کی تعداد چھ ہے۔ان کا زمانۂ تحریر دسمبر ۱۹۴۴ء سے ستمبر ۱۹۶۹ء تک کا ہے۔ذیل میں انہیں ان کی زمانی ترتیب کے مطابق پیش کیا جارہا ہے۔مکاتیب اصلاحی کا پہلا مکتوب بھی نظام القرآن کے مذکورہ بالا شمارے کی زینت بن چکا ہے جسے یہاں حواشی کے ساتھ دیا جارہا ہے۔ راقم کی محدود معلومات کی حد تک باقی خطوط پہلی بار شائع ہورہے ہیں۔مولانا اصلاحی کے ان خطوط کے ساتھ ملک غلام علی صاحب (م ۱۹۹۴) کا بھی ایک مکتوب زیرِ نظر مضمون میں شامل کیا جارہا ہے جو انہوں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی نیابت کرتے ہوئے فروری ۱۹۵۵ میں تحریر کیا تھا۔مولانا مرحوم کے خطوط کا موضوع قرآن اور تدبرِ قرآن ہیں جن کے مطالعہ سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ:

''......مولانا کی اہم مراسلت تدبرِ قرآن کے حوالے سے مولانا جلیل احسن ندوی سے ہوئی تھی، انہیں بھی منصۂ شہود پر آنا چاہیے۔ان میں بہت سے قیمتی موتی ہیں۔'' (عبدالبراثری فلاحی: 'تدبرِ' کا مکاتیب اصلاحی نمبر-ایک مطالعہ، مجلّہ حیاتِ نو، ستمبر ۱۹۹۹، ص:۱۲)

....

مکتوبِ اوّل

مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

کتاب کی وہ فصل جس میں تکفیر کی بحث ہے بغور ملاحظہ فرمایئے۔ ❶ اس کا ماخذ میں نے لکھ دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ چیز تمام انبیاء کے طریق دعوت سے ثابت ہے۔ ❷ نیز تکفیر دینی اصل حقیقت کے اعتبار سے حدود وتعزیرات میں شامل ہے۔ اور حدود وتعزیرات کے اجراء کے لیے یہ شرائط سہ گانہ ❸ معلوم ومسلم ہیں۔ رہا موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچانے کا سوال تو اس کا بہترین طریقہ وہی ہے جو 'حقیقت شرک' میں اختیار کیا گیا ہے، یعنی جو چیزیں شرک وکفر نہیں ان کا شرک وکفر ہونا واضح کردیا جائے۔ ❹ جو چیزیں کفر وشرک ہیں ان کا کفر وشرک ہونا اللہ کی کتاب سے متعین ہے مگر ان کے مرتکبین کے حالات مختلف ہوسکتے ہیں۔ بہت ممکن ہے ان کو شعور نہ ہو، بہت ممکن ہے ان کی حالت اضطرار واکراہ کی ہو۔ نیز اس عہد کی سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ خلافت علی منہاج السنۃ کا نظام باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے تبیین حق کا کام بالکل بند ہے اور جس میں فسوق کا فتنہ عالمگیر ہے۔ میرے نزدیک امت مرحومہ پر یہ زمانہ انبیاء کے فتنے کے زمانہ سے

اشبہ ہے اس لیے اس عہد کا فطری تقاضہ ہے کہ پہلے لوگوں میں حق و باطل کا شعور پیدا کیا جائے یہاں تک کہ ایک صالح اور بااختیار جماعت وجود میں آجائے اس کے بعد ہمیں حق حاصل ہوسکتا ہے کہ ہم ان لوگوں کو سزا دے سکیں جو دیدہ ودانستہ حق سے انحراف کرتے ہیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ ایک مرتبہ اور اس فصل کو بغور پڑھ لیں جو ''وقت کا اصلی فرض اور بعض شبہات کا ازالہ'' کے عنوان سے لکھی گئی ہے تو تمام شبہات خود بخود دور ہوجائیں گے۔ میں نے ان تمام خدشات سے تعرض کیا ہے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی، حفیظ منزل، اعظم گڑھ ❺

مولانا جلیل احسن ندوی، مدرسہ مصباح العلوم ❻، مدار گیٹ، بریلی

[۸؍دسمبر۱۹۴۴] ❼

....

توضیحی حواشی

❶ مکتوب نگار نے جس کتاب اور اس کی فصل کا حوالہ دیا ہے وہ بالترتیب ان کی مشہور تصنیف 'حقیقت شرک' اور اس کا آٹھواں باب بہ عنوان 'وقت کا اصلی فرض اور بعض شبہات کا ازالہ' ہے۔ 'حقیقت شرک' کا پہلا ایڈیشن دائرہ حمیدیہ، قرول باغ، دہلی نے عبداللطیف اعظمی (م۲۰۰۲) کے اہتمام میں جون ۱۹۴۴ء میں شائع کیا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کتاب شائع ہونے سے قبل اس کا ایک باب 'کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟' ماہ نامہ ترجمان القرآن، پٹھان کوٹ میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا: 'یہ اس کتاب کا ایک باب ہے جو مولانا امین احسن صاحب نے ''حقیقت شرک'' کے نام سے حال میں تصنیف فرمائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عنقریب شائع ہوجائے گی۔' (ترجمان القرآن، مارچ واپریل ۱۹۴۴ء، صفحہ ۸۴)

❷ مصنف نے اس فصل میں اس نکتہ پر گفتگو کی ہے کہ جو مسلمان اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے کفر وشرک میں مبتلا ہیں، دعوت کا کام کرنے والے اگر انہیں کافر ومشرک سمجھتے ہوئے ان میں دعوتی کام کریں گے تو یہ سراسر غیر انبیائی طریق دعوت ہوگا۔ قرآنی دعوت کے

تدریجی مراحل کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ باوجودے کہ نبی کریم ﷺ کی مدعو قوم کافر ومشرک تھی، آپ نے دعوت کا آغاز 'اے کافرو' اور 'اے مشرکو' کے الفاظ سے نہیں کیا، بلکہ 'اے میری قوم' اور 'اے انسانو' سے کیا۔ لہٰذا ایک داعی کو یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ آپ ﷺ کے امتیوں کو کافر یا مشرک فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز کرے۔

❸ مذکورہ بالا فصل سے یہ اقتباس شرائط سہ گانہ پر روشنی ڈالتا ہے: ''تکفیر کا اصلی مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مرتد قرار دے کر اس کو وہ سزا دی جائے جو اسلام میں ارتداد کے لیے مقرر ہے۔ .... اس سزا کے نفاذ کے لیے شرط ہے کہ ایک جماعت موجود ہو جو صالح ہو۔ ایک غیر صالح جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غیر صالح قرار دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ جماعت بااختیار ہو۔ کوئی بے اختیار جماعت تعزیرات وحدود کے اجرا کا حق نہیں رکھتی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایک صالح جماعت کے قیام سے ماحول ایسا بن چکا ہو کہ وہ منکرات ومعاصی کے لیے سازگار نہ رہ گیا ہو اور خدا کے بندوں پر دین کی حجت تمام کرنے اور حق کی توضیح کے ضروری وسائل برسر کار ہوں۔'' (حقیقت شرک وتوحید، ص:۱۵۶)

❹ ''جو چیزیں شرک وکفر نہیں ان کا شرک وکفر ہونا واضح کر دیا جائے''، اس عبارت میں قدرے ابہام ہے۔ بہرحال صاحب تحریر کا مدعا یہ ہے کہ جو چیزیں بظاہر یا غلط فہمی کی بنیاد پر شرک وکفر متصور نہ کی جاتی ہوں ان کا شرک وکفر ہونا واضح کر دیا جائے۔

❺ حفیظ منزل، شہر اعظم گڑھ میں بڑا پل روڈ ویز کے پاس واقع ہے جو یکے از نامورانِ اعظم گڑھ، حافظ حاجی ڈاکٹر حفیظ اللہ (سول سرجن) (م ۱۹۴۹) کی رہائش گاہ تھی۔ ان کی آخری آرامگاہ بھی وہیں ہے۔ موصوف مولانا فراہی (م ۱۹۳۰) کے گہرے عقیدت مند تھے اور ان کے ذاتی معالج بھی، نیز مولانا اصلاحی سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ان کی دعوت پر مولانا فراہی بغرض علاج ان کے یہاں متھرا تشریف لے گئے تھے جہاں وہ سول سرجن کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن علاج ناکام رہا اور مولانا کا انتقال ہوگیا۔ جب ۱۹۳۵ میں دائرہ حمیدیہ کی داغ بیل پڑی تو ڈاکٹر حفیظ اللہ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اسلام کی اشاعت، مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور فراہی نقطۂ نظر کے مطابق عام فہم زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر اور مولانا فراہی کے مسودات اور تراجم کی اشاعت کی غرض سے انہوں نے ۱۹۴۶ء میں پچاس ہزار روپیوں کی خطیر رقم وقف کی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ظفر الاسلام

اصلاحی: ڈاکٹر حفیظ اللہ اور مولانا امین احسن اصلاحی، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ۔
❻ مولانا جلیل احسن ندوی مدرسہ مصباح العلوم، بریلی سے بحیثیت استاد وابستہ تھے۔ اسی زمانہ میں مصباح اللغات کے مرتب مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (م ۱۹۷۱) بھی وہاں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ لغت کی تیاری میں انہیں مولانا جلیل احسن ندوی کا تعاون حاصل رہا۔ مرتب نے ان کے علمی فیوض سے استفادے کا مقدمہ میں اعتراف کیا ہے۔
❼ یہ خط پوسٹ کارڈ پر لکھا گیا ہے اور بغیر تاریخ کے ہے۔ اس پر لگی اعظم گڑھ اور بریلی کے ڈاک خانوں کی مہروں کو بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس پر بالترتیب ۸/اور ۱۱/دسمبر ۱۹۴۴ء کی تاریخیں ثبت ہیں۔

❖ ❖ ❖

مکتوب دوم

رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

برادر گرامی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کارڈ موصول ہوا۔ میں نے ان قسموں پر جب جب غور کیا میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اس میں **نازعات** اور **ناشطات** ہواؤں کی صفتیں ہیں اور **سابحات** و **سابقات** بادلوں کے لیے۔ یہ قسمیں ذاریات کی قسموں سے مشابہ ہیں۔ **مدبرات أمرا** ❶ میں بالفاظ دیگر اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے جس مفہوم کی طرف ذاریات میں فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْراً ❷ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

یہ سارے الفاظ قرآن اور کلام عرب میں بشکل فعل یا بصورت صفت ہواؤں اور بادلوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ تھوڑے سے تتبع سے شواہد بآسانی مل جائیں گے۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ ❸ اور اس طرح کی نظیریں جمع کر لیجیے۔

مقسم علیہ یہاں محذوف ہے اور وہ ہے زَلْزَلَةُ السَّاعَةِ۔ اس کی طرف اشارہ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ❹ کے ظرف سے ہو رہا ہے اور حذفِ واقعہ یہاں اس کی شدت وہولناکی پر دلیل ہے ❺۔

غالباً یہی سوال کچھ دن ہوتے ہیں سرائمیر سے احتشام صاحب ❻ نے کیا تھا۔

لیکن عدیم الفرصتی کے سبب سے میں ان کو جواب نہ لکھ سکا۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر اس خط کی ایک نقل آپ ان کو بھی بھجوادیں گے۔

عزیزی ابوصالح ❼ کا قیام راولپنڈی میں ہے۔ اہلیہ اس وقت اجتماع میں گئی ہوئی ہیں۔ ان شاءاللہ ان کو آپ کا سلام پہنچادوں گا۔

دائرہ ❽ نے کوئی نئی چیز چھاپی ہو تو ضرور بھجوایئے۔ پرسانِ حال کو سلام شوق۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

❾7/2/58

بخدمت جناب مولانا جلیل احسن صاحب ندوی

مرکز جماعت اسلامی ہند، رام پور، یوپی (بھارت)

Rampur, UP, India

....

توضیحی حواشی

❶ ''وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقاً، وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطاً، وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحاً، فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقاً، فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْراً'' (النازعات: ۱-۵)۔

❷ ''فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْراً'' (الذاریات: ۴)۔

❸ ''تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ'' (القمر: ۲۰)۔

❹ ''يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ'' (النازعات: ۶)۔

❺ تفصیل کے لیے دیکھیے تدبر قرآن، جلد ہشتم میں سورہ النازعات کی تفسیر۔

❻ مولانا احتشام الدین اصلاحی مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر کے سابق استاد اور صدر مدرس، عربی نحو پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ ۳ر مئی ۲۰۱۶ کو نوے سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

❼ مولانا مرحوم کے سب سے بڑے فرزند ابوصالح اصلاحی پیشۂ صحافت سے وابستہ تھے۔ صحافیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ پی آئی اے کی پرواز PK705 سے ۲۰ر مئی ۱۹۶۵ کو قاہرہ جارہے تھے۔ جہاز قاہرہ کے ہوائی مستقر پر اترتے ہوئے تباہ ہوگیا اور سوائے چھ افراد کے طیارے پر سوار سبھی افراد جاں بحق ہوگئے جن میں ابوصالح اصلاحی بھی شامل تھے۔

❽ یعنی الدائرۃ الحمیدیہ جسے مولانا فراہی کے مسودات کی ترتیب واشاعت کی غرض سے ۱۹۳۵ کے اواخر میں مدرسۃ الاصلاح پر قائم کیا گیا تھا۔

❾ یہ مولانا کا واحد مکتوب ہے، جس پر تاریخ انگلش میں درج ہے۔

❖ ❖ ❖

مکتوب سوم

ماہنامہ ''میثاق''

رحمان پور، اچھرہ، لاہور

محبی مولانا زادفضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ موصول ہوا۔ یادآوری کے لیے دل سے شکرگزار ہوں۔ آپ حضرات کے سوالوں کے جواب تو میں محض تعمیلِ حکم میں دیتا ہوں۔ ورنہ آپ حضرات خود صاحب علم ہیں اور آپ کا علم آپ کے لیے کافی ہے۔

تاہم اگر آپ مجھے کسی خدمت کے لائق سمجھتے ہیں تو جو باتیں آپ کو کھٹک رہی ہوں لکھ بھیجیے، میں اس سوال کا بھی جو آپ نے اس خط میں لکھا ہے اور دوسرے سوالات کا بھی جو آپ لکھیں گے میثاق ❶ میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ مشکل یہ ہے کہ سوالات بے حد وشمار جمع ہوگئے ہیں اور میرے پاس نہ تو لکھنے کے لیے وقت ہے اور نہ میثاق میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر سوال کا جواب دیا جاسکے۔

آپ حضرات سے اس سلسلہ میں کسی استمداد کی جرأت اس وجہ سے نہ کرسکا کہ معلوم نہیں آپ لوگ مجھے کسی مدد کا مستحق سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔

مدرسہ اصلاح کو اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ میں تو یہاں سے اس کے لیے صرف دعا ہی کرسکتا ہوں۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

۲۰رمئی ۱۹۶۰

بخدمت گرامی مولانا جلیل احسن صاحب زادلطفہ، الحسنات، رام پور، یوپی، انڈیا

Rampur, UP, (India)

توضیحی حواشی

❶ مولانا اصلاحی نے جون ۱۹۵۹ میں لاہور سے ماہ نامہ میثاق جاری کیا تھا جس میں ان کی تفسیر تدبر قرآن کے اجزاء شائع ہوتے رہے۔ مجلّہ ۱۹۶۵ تک مولانا کی ادارت میں شائع ہونے کے بعد بند ہوگیا۔ انقطاع کے بعد اس کا اجراء ثانی ڈاکٹر اسرار احمد نے کیا۔ اصلاحی عرصۂ ادارت کے میثاق کی فائلوں کی مدد سے اس میں مولانا ندوی کے شائع شدہ استفسارات و مضامین کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔

❖❖❖

مکتوب چہارم

ماہنامہ ''میثاق''

رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

مکرمی و محبی زاد لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے دو عنایت نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ میں ایک ہفتہ کے لیے باہر چلا گیا تھا اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

آپ نے تفسیر کی جن غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ اگست کا پرچہ تو چھپ چکا اب ستمبر کے پرچہ میں ان کی تصحیح ہو سکے گی ❶۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس قسم کی چیزوں پر نگاہ رکھیں اور مجھے ان سے مطلع کرتے رہیں۔

آپ میثاق کے لیے ہر قسم کے مضامین بھیج سکتے ہیں۔ علمی اور تحقیقی بھی، اور اصلاحی اور تربیتی بھی۔ اصلاحی اور تربیتی مضامین اگر عوام کو سامنے رکھ کر لکھے جائیں بالخصوص اخلاقی عنوانات پر تو وہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔ میں نے تزکیۂ نفس کے عنوان سے سلسلہ شروع کیا تھا لیکن وقت کی کمی کے سبب سے جاری نہ رکھ سکا۔

دوسرے اصحاب علم کے مضامین کے ترجمے بھی مفید رہیں گے۔ زبان حتی الوسع آسان رہے۔ یوسف صاحب ❷ کی خدمت میں سلام مسنون۔ امید ہے آپ کے حصہ کا پرچہ موصول ہو گیا ہوگا۔ تدبر قرآن کی طباعت کے متعلق آپ کی رائے پر عمل کرنے میں بعض زحمتیں ہیں، اگر ان کو دور کیا جا سکا تو ان شاء اللہ جلدی ہی آپ کے سامنے اس کی دوسری قسط آجائے گی۔ دفتر سے معلوم ہوا ہے کہ تفسیر بسم اللہ اور فاتحہ کا

ایک نسخہ آپ کو بھیجا جا چکا ہے ❸، خدا کرے پہنچ گیا ہو۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

۲/اگست ۱۹۶۱

بخدمت گرامی مولانا جلیل احسن صاحب ندوی، دفتر الحسنات، رام پور

Rampur (India)

....

توضیحی حواشی

❶ اس تصحیح کی نوعیت اور تفصیل جاننے کے لیے راقم نے ادارۂ میثاق، لاہور سے رابطہ قائم کر کے ستمبر ۱۹۶۱ کے پرچے سے متعلقہ صفحات کے عکس کے حصول کی درخواست کی۔ متعدد یاددہانیوں کے بعد اطلاع ملی کہ خود ادارہ کے اپنے ہی ریکارڈ میں یہ شمارہ نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

❷ معروف مصنف، ماہنامہ 'ذکریٰ' کے مدیر اعلیٰ اور رکن مرکزی مجلس شوریٰ، جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف اصلاحی

❸ آیت بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر مکتبہ میثاق سے علاحدہ کتابی شکل میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب وہ تدبر قرآن، جلد اول کا حصہ ہے۔

❖ ❖ ❖

مکتوب پنجم

رحمان پور، اچھرہ، لاہور

مکرمی و محبی زاد لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کل آپ کی جامعہ ❶ کے ایک طالب العلم کا خط آپ کی سفارش کے ساتھ موصول ہوا۔ میں تو بڑے شش و پنج میں پڑ گیا تھا لیکن اسی وقت میرے ایک دوست آ گئے اور انہوں نے اپنی طرف سے ایک نسخہ کتاب ❷ کا آپ کے شاگرد کو بھیجنے کی پیش کش کی۔ اور اس طرح اللہ تعالی نے مجھے آپ سے سرفراز ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔ کل ہی دفتر کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ کتاب آپ کو بھیج

دی جائے۔ اصل یہ ہے کہ اس کتاب پر لاگت اتنی آئی ہے کہ میں اپنے عزیز احباب واعزہ کو بھی کتاب ہدیۃً دینے کی ہمت نہ کرسکا۔ مدرسۃ الاصلاح سے طلبہ کا بھی ایک خط آیا ہوا ہے اور میں ان کو ایک جلد کا حقدار بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے سوا کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کے لیے بھی کسی دوست کی امداد چاہوں ❸۔

مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ کتاب آپ کو پسند آئی۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے۔ اب یہی میری زندگی کا آخری کام ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ کتاب کی دوسری جلد جو سورہ نساء اور مائدہ کی تفسیر پر مشتمل ہوگی تیار ہے اور میں اب تیسری جلد پر کام کر رہا ہوں۔

جن قدرداں نے مجھے خط لکھا تھا ان کو میرا سلام پہنچا دیجیے اور کتاب پہنچنے پر وہ رسید لکھ دیں تاکہ مجھے اطمینان ہو۔ آپ اگر کتاب کے بارے میں تفصیل سے اپنی رائے لکھیں گے تو مجھے اس سے اطمینان ہوگا۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

۲۴رفروری ۱۹۶۸❹

....

توضیحی حواشی

❶ یعنی جامعۃ الفلاح جس سے مولانا جلیل احسن ندوی ۱۹۶۴ء سے عمر کے آخری لمحوں تک، بجز ایک مختصر درمیانی وقفہ کے، وابستہ رہ کر تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ جاہلی عربی ادب اور قرآنیات پر آپ کی گہری نظر تھی۔ بجا طور آپ کو تخلیقی صلاحیتوں کا حامل مفسر کہا جا سکتا ہے۔

❷ کتاب سے مراد تدبر قرآن جلد اول ہے جو سورہ آل عمران تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

❸ 'تدبر- مکاتیب اصلاحی نمبر' میں شامل خطوط نمبر ۱ تا ۱۲ (ص: ۷ تا ۱۳) جلد اول کی طباعت واشاعت میں حائل مالی دشواریوں پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں۔

❹ یہ مکتوب سادہ کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے اور جیسا کہ مضمون سے ظاہر ہے، جامعۃ الفلاح کے

پتے پر بھیجا گیا ہے۔

❖❖❖

مکتوب ششم

رحمان پور، اچھرہ، لاہور

مکرمی مولانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ موصول ہوا۔ اس بات سے بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ آپ حضرات جیسے اصحاب علم میری ناچیز کوششوں کی قدر کرتے ہیں۔

الحمدللہ اب تیسرے گروپ ❶ کی پہلی سورہ یونس کی تفسیر زیر قلم ہے۔ سورہ توبہ تک کام پورا ہوگیا ہے۔ دوسری جلد کی کتابت ہوچکی ہے۔ کاپیاں پڑھی جارہی ہیں۔ اس کے بعد پریس کے حوالہ کردی جائے گی۔ یہ جلد سورہ اعراف پر تمام ہوگی اور ضخامت کم وبیش جلد اول کے برابر ہوگی۔

آپ کے پرچے آپ کے بتائے ہوئے پتہ پر بھیجنے کی تاکید میں نے ڈاکٹر صاحب ❷ کو کردی ہے۔ انہوں نے تعمیل کا وعدہ کیا ہے۔ جملہ پرسان حال کو سلام شوق۔ نسیم غازی صاحب ❸ کو دعا۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

۳؍ستمبر ۱۹۶۹

بخدمت گرامی مولانا جلیل احسن صاحب

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی (بھارت)

Bilaria Ganj, Azamgarh, UP (India)

....

توضیحی حواشی

❶ مولانا اصلاحی نے قرآنی سورتوں کو سات گروپس میں تقسیم کیا ہے۔ ہر گروپ کا آغاز مکی سورتوں سے اور اختتام مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تدبر قرآن جلد اول، مقدمہ/قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو۔

❷ ڈاکٹر اسرار احمد (م۲۰۱۰) مولانا اصلاحی کے شاگرد اور ماہنامہ میثاق کے دورِ اول میں ان کے معتمد خاص اور مدارالمہام تھے۔لیکن ۷۰ کے عشرے میں شدید اختلافات کی بنا پر استادو شاگرد کی راہیں جدا ہوگئیں۔ ڈاکٹر اسرار نے ۱۹۷۱ میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن' اور ۱۹۷۵ میں 'تنظیم اسلامی' قائم کی جس کے وہ ۲۰۰۲ تک امیر رہے۔

❸ نسیم احمد غازی (فلاحی) جامعۃ الفلاح کے ایک ہونہار طالب علم اور اس کے ایک ممتاز گریجویٹ، اس وقت جماعت اسلامی ہند کے ادارے اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ (دہلی) کے ذمہ دار ہیں اور تفہیم القرآن کا ہندی میں ترجمہ کررہے ہیں۔حال میں ان کے قلم سے اس کی تیسری جلد کا ہندی ترجمہ شائع ہوا ہے۔

❖❖❖

مکتوب ملک غلام علی ❶

مکرمی ومحترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مولانا امین احسن صاحب کو موصول ہوگیا تھا۔افسوس ہے کہ جواب میں تاخیر ہوگئی جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔مولانا سے میں نے دریافت کیا ہے۔ان کے نزدیک ردّت کی سزا بعض حالات میں ازروئے شریعت موت بھی ہے۔اگرچہ یہ آخری اور انتہائی سزا ہے۔دراصل شریعت کے ہر حکم، قانون اور تعزیر کا ماخذ قرآن سے نکالنے پر اصرار صحیح نہیں ہے۔احکام وقوانین کا جس طرح ماخذ کتاب ہے اسی طرح سنت ثابتہ بھی ہے۔تاہم مولانا کے نزدیک ردّت کی انتہائی سزا سورہ مائدہ رکوع ۵ ❷ سے مستنبط ہوتی ہے۔اسلامی تہذیب ومعاشرت کو منہدم کرنے والے سارے افعال جن کے ساتھ کوئی ایسے حالات وعذرات موجود نہ ہوں جوان کی سنگینی اور شناعت کو کم یا ہلکا ثابت کرسکیں تو ان افعال کے مرتکبین کو اللہ اور اس کے رسول سے علانیہ جنگ اور مورچہ بندی کرنے والوں کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے اور اسلامی حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے جرائم میں تقتیل، تصلیب، تقطیع ایدی وارجل اور انفاء کی عبرت انگیز اور ہولناک سزائیں دے۔اللہ اور رسول سے محاربہ کی تعریف میں سارے ایسے جرائم آتے ہیں جو پوری جسارت، بے حیائی اور ڈھٹائی سے کیے جائیں، جن کے لیے ادنیٰ عذر اور وجہ بھی موجود نہ ہو، جن سے ریاست کی

بنیادوں پر کاری ضرب پڑتی ہو اور جو مسلمانوں کے عقائد، معیشت اور معاشرت میں برہمی، ابتری اور اختلال پیدا کرنے والے ہوں۔ نبی ﷺ کی قولی و فعلی سنت سے ثابت ہے کہ ایسے شدید اور گھناؤنے قسم کے جرائم میں زنائے محصن، ارتداد، لوٹ مار اور اکلِ ربا وغیرہ شامل ہیں۔ اس آیت کے الفاظ پر بھی غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قتل، صلیب اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کے لیے مبالغے اور تکثیر کا باب استعمال کیا گیا ہے، قتل کے بجائے تقتیل، صلب کے بجائے تصلیب اور قطع کے بجائے تقطیع۔ قبیلۂ عُکل وعُرَینہ کے لوگوں نے یہی محاربہ کیا تھا اور انہیں ایسی سزا دی گئی جس میں عبرت و نکال کا پہلو بالکل عیاں تھا۔ ❸

مولانا امین احسن صاحب کے استدلال کی طرف راقم الحروف نے اپنے الفاظ میں اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔ اگر انہیں کبھی فراغت واطمینان نصیب ہوا تو ان شاءاللہ خود اس بحث کو شاید پھیلا کر قلم بند کر سکیں۔ سورۂ توبہ اور سورۂ بقرہ (فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ) ❹ سے بھی علماء نے ردّت کی انتہائی سزا کے حق میں دلائل اخذ کیے ہیں۔ سورۂ توبہ سے ہی مولانا مودودی بھی استنباط کرتے ہیں۔ وہ بحث آپ سورۂ توبہ کی تفسیر، تفہیم میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے ایک تبصرہ بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی سورۂ توبہ سے استشہاد کیا گیا ہے، اسے بھی آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ❺

تعجب ہے کہ آپ نے ادھر مراجعت کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی۔ خدا کرے آپ کا اطمینان اس مختصر عریضے سے ہو جائے۔ سب کی جانب سے سلام عرض ہے۔

خاکسار

غلام علی

۱۶؍فروری ۵۵ ❻

توضیحی حواشی

❶ ملک غلام علی (۱۹۲۰-۱۹۹۴) مولانا مودودی مرحوم کے خصوصی علمی معاون تھے۔ جن دنوں مولانا مودودی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں دینیات کے اعزازی

لیکچرر تھے ملک صاحب کالج میں تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے۔ مولانا کا عرصۂ تدریس زیادہ طویل نہ رہا کیوں کہ ان کے خیالات سے ارباب کالج کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، چناں چہ مولانا ازخود مستعفی ہوگئے۔ مولانا کے افکار سے متاثر ملک صاحب نے بھی کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مولانا کی معیت اختیار کرلی۔ وہ ان ۷۵ افراد میں شامل ہیں جنھوں نے جماعت کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنی دلچسپی، لگن اور محنت سے عربی، فارسی اور انگلش میں مہارت بہم پہنچائی۔ تقسیم کے بعد مولانا مودودی نے ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں اپنا خصوصی علمی معاون بنالیا اور اس حیثیت میں وہ مولانا مرحوم کی زندگی کے آخری لمحوں تک علمی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ مولانا کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک بار ملک صاحب سے فرمایا: 'ملک صاحب دکھانے کی کیا ضرورت ہے، آپ میری طرف سے لکھ کر بھیج دیا کیجیے۔' ان کی علمی بصیرت کے پیش نظر حکومت نے انہیں ۱۹۸۱ میں وفاقی شرعی عدالت کا جج مقرر کردیا، وہ جون ۱۹۸۵ تک اس منصب پر فائز رہے۔ ان کے عدالتی فیصلے، 'رسائل ومسائل حصہ ششم وہفتم' اور 'خلافت وملکویت پر اعتراضات کا علمی جائزہ' ان کی علمی ثقاہت کی دلیل ہیں۔ انہوں نے عبدالقادر عودہ شہیدؒ کی تصنیف ''الاسلام وأوضاعنا القانونية'' کا اردو ترجمہ 'اسلام کا نظام قانون' کے نام سے کیا ہے۔ (دیکھیے: ملک غلام علی کی یاد میں، ماہ نامہ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۴، صفحات: ۴۱ تا ۵۶)

❷ ''إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ، ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ.'' (المائدہ:۳۳)

❸ آیت محاربہ کی تشریح کے لیے دیکھیے تدبر قرآن جلد دوم میں سورہ المائدہ کی تفسیر۔ عکل وعرینہ کے لیے دیکھیے: صحیح البخاری، كتاب المغازی، قصة عكل وعرينه۔

❹ البقرہ:۵۴

❺ یہ واضح نہیں کہ یہاں کس تبصرہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ کہاں اور کب شائع ہوا ہے۔ تلاش کے باوجود کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔ مولانا مودودی کا رسالہ ''مرتد کی سزا اسلامی

قانون میں' 'ترجمان القرآن میں اکتوبر ۱۹۴۲ سے جون ۱۹۴۳ تک شائع ہوتا رہا۔ اس میں سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ سے استشہاد کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کی طرف اشارہ ہو۔

❻ خط سادہ کاغذ پر تحریر کیے جانے کی وجہ کر اس پر مکتوب الیہ کا پتا درج نہیں ہے۔ اسے ثانوی درس گاہ رامپور کے پتے پر بھیجا گیا ہوگا کیوں کہ ۱۹۵۵ میں مولانا درس گاہ سے منسلک تھے۔

❖❖❖

اگست ۱۹۴۱ میں تشکیل جماعت کے بعد مولانا مودودی اپنے ملک گیر دورے کے ضمن میں سال کے اواخر میں مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر مولانا اصلاحی نے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی اور مارچ ۱۹۴۴ میں دارالاسلام، پٹھان کوٹ تشریف لے گئے۔ وہاں ان کا استقبال کرنے والوں میں مولانا جلیل احسن صاحب بھی تھے (نقوش وتاثرات، ص: ۶۳-۶۴)۔ پہلے مکتوب مؤرخہ ۸/ دسمبر ۱۹۴۴ پر مکتوب نگار نے اپنا پتہ مدرسۃ الاصلاح کا نہ لکھ کر 'حفیظ منزل، اعظم گڑھ' تحریر کیا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دسمبر ۱۹۴۴ میں مکتوب نگار کا مدرسہ سے تعلق نہیں تھا، ورنہ اس کا پتا چھوڑ کر ۳۰، ۳۵ کلومیٹر کی مسافت پر واقع حفیظ منزل کا پتا نہ لکھتے۔ دوسرے لفظوں میں مارچ تا دسمبر ۱۹۴۴ میں مولانا مدرسے سے علاحدہ تھے۔ استاد گرامی مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب راوی ہیں کہ ۱۹۴۴ میں (ہی) عربی چہارم میں مولانا امین احسن صاحب نے انہیں قرآن مجید پڑھایا تھا (حیاتِ نو، اگست ۱۹۹۸، ص: ۳۹)۔ تدریس کی مدت استاد گرامی کی وضاحت کے مطابق زیادہ سے زیادہ چار ماہ رہی ہوگی اس کے بعد مولانا مرحوم چلے گئے۔ مولانا اصلاحی کے ایک دوسرے شاگرد، مولانا عبدالرحمان اصلاحی جامعی (م ۲۰۰۹) کا بیان ہے کہ جب وہ ۱۹۴۳ میں جامعہ ملیہ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے مدرسۃ الاصلاح واپس آئے تو مولانا اصلاح کو خیر باد کہہ چکے تھے (علوم القرآن، ص: ۵۶۸)۔ اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ۱۹۴۳ میں مدرسہ پر نہیں تھے۔ لیکن ان کی مدرسۃ الاصلاح سے قطع تعلقی کا آغاز ۱۹۴۳ سے نہیں، بلکہ ۱۹۴۲ سے ہوتا ہے۔ اس خیال کی بنیاد مولانا مودودی کا مولانا مسعود عالم ندوی کے نام ۲۰/ دسمبر ۱۹۴۲ کو پٹھان کوٹ سے تحریر کردہ وہ خط ہے جس میں مکتوب نگار نے مولانا امین احسن صاحب کے بارے میں لکھا: 'ان کا پتا یہ ہے: بتوسط ڈاکٹر حاجی حافظ حفیظ اللہ صاحب، ریٹائرڈ سول سرجن، حفیظ، منزل، اعظم گڑھ' (خطوط مودودی، حصہ اول، ص: ۱۰۸)۔ یہاں پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اس وقت مولانا مدرسے سے وابستہ تھے تو اس سے ہٹ کر دوسری جگہ کا پتا

دینے کی دوسری توجیہ بھلا کیا کی جاسکتی ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے کہ ۱۹۴۲ میں مولانا مدرسہ سے کب علاحدہ ہوئے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ دسمبر ۱۹۴۲ سے دسمبر ۱۹۴۴ تک کے درمیانی عرصے میں مولانا امین احسن صاحب کا مدرسۃ الاصلاح سے تعلق منقطع رہا۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یہ انقطاع باضابطہ تعلق کا تھا، قطعی انقطاع نہیں تھا۔ اس عرصہ میں مولانا کا مدرسہ سے عمومی تعلق برقرار رہا اور وقتاً فوقتاً مدرسہ پر ان کی آمدورفت رہی۔ ❶ نہ صرف غیر رسمی تعلق باقی رہا بلکہ مارچ ۱۹۴۴ میں پٹھان کوٹ منتقلی سے قبل عربی چہارم کو انہوں نے قرآن کا درس بھی دیا۔ البتہ یہ منتقلی براہ راست مدرسے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ان کے اپنے وطن بمہور سے ہوئی تھی۔ اس پر روشنی مولانا عبدالرحمان ناصر اصلاحی کے ایک دوسرے بیان سے پڑتی ہے جس کی روایت مولانا نظام الدین اصلاحی نے کی ہے:

''مولانا امین احسن اصلاحی مدرسہ سے بددل ہوکر بمہور چلے گئے تھے اور گھر پر رہ کر کچھ علمی کام کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ اس کے لیے انہوں نے اپنے گھر کے ایک چھوٹے سے کچے سفالہ پوش کمرے میں جنگلے لگوائے، اسے ہوادار بنایا تاکہ اس میں بیٹھ کر علمی کام انجام دیں۔ میں (یعنی ناصر صاحب) ان سے ملنے کے لیے بمہور گیا اور یہ سب دیکھا۔ ....مولانا کم و بیش چار یا پانچ ماہ بمہور میں رہے، اس کے بعد مولانا مودودی نے بمہور سے ان کو اپنے پاس بلایا نہ کہ مدرسۃ الاصلاح سے۔'' (حیات نو، اگست ۱۹۹۸، ص:۴۱)

ناصر صاحب نے مولانا کی مدرسے سے بددلی کے اسباب تو نہیں بتائے، البتہ ان کی صراحت سے اس خیال کی نفی ہوجاتی ہے کہ مولانا اصلاحی نے پٹھان کوٹ کے لیے 'استاد کا آستانہ' تیاگ کے مدرسۃ الاصلاح سے براہ راست رختِ سفر باندھا تھا۔ ❷ استاد کے آستانے کو تو وہ ۱۹۴۲ ہی میں خیرباد کہہ چکے تھے۔ معلوم نہیں علاحدگی کے بارے میں خود مدرسۃ الاصلاح کا اپنا ریکارڈ کیا کہتا ہے۔

فطری طور پر ذمہ داران مدرسہ پر مولانا اصلاحی کی مدرسے سے علاحدگی شاق گزری اور قوی گمان ہے کہ انہیں واپس لانے کی کوششیں کی گئی ہوں گی۔ مولانا جب تک اعظم گڑھ یا بمہور میں رہے ذمہ دارانِ مدرسہ کو مولانا کی واپسی کی آس رہی ہوگی۔ لیکن ان کے پٹھان کوٹ منتقل ہوجانے کے بعد یہ آس بھی ختم ہوگئی۔ اب آخری چارہ یہ تھا کہ اس معاملہ میں مولانا مودودی سے استمداد کی جائے۔ چناں چہ ناظم مدرسہ حاجی رشیدالدین صاحب (م ۱۹۵۹) نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۴ کو مولانا مودودی کے نام تحریر کردہ ایک مفصل مکتوب میں تجویز پیش کی کہ سال کے چھ ماہ مولانا اصلاحی مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دیں اور باقی چھ ماہ دارالاسلام میں رہیں۔ لیکن تجویز بارآور نہ ہوسکی (خطوطِ مودودی، حصہ دوم

صفحات: ۲۹۵ تا ۳۰۱)۔

مکتوب پنجم کے سوا باقی تمام خطوط پوسٹ کارڈ پر تحریر کیے گیے ہیں جن پر مکتوب الیہ کے پتے درج ہیں۔ مکاتیب دوم، سوم اور چہارم رام پور میں دو مختلف پتوں پر بھیجے گئے ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندوی رام پور میں ثانوی درس گاہ میں استاد تھے جسے جماعت اسلامی ہند نے عصری تعلیم گاہوں کے گریجویٹس کو مستند دینی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ درس گاہ ۱۹۵۰ سے جولائی ۱۹۶۰ تک قائم رہی۔ اس کا نصاب چار سالہ اور خاصا intensive تھا۔ قرآن کریم اور عربی ادب مولانا کے خاص تدریسی مضامین تھے۔ درس گاہ، مرکز جماعت اسلامی ہند (جو ان دنوں رام پور میں تھا) کی عمارت کے ایک حصے میں قائم تھی۔ اسی وجہ سے مکتوب دوم پر پتا مرکز کا تحریر ہے۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے جو خطوط مولانا جلیل احسن ندوی کو پوسٹ کارڈ پر تحریر کیے ہیں، ان پر پتا 'ثانوی درس گاہ، مرکز جماعت اسلامی ہند، رام پور' تحریر ہے۔ درس گاہ بند ہو جانے کے بعد، بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا ندوی کو جماعت کے ادارۂ تصنیف میں لے لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے اس سے استعفاء دے دیا کہ روز لکھنے کا موڈ نہیں ہوتا جب کہ تنخواہ ہر دن کی ملتی ہے (حیات نو، اکتوبر- دسمبر ۲۰۱۲، ص: ۱۷)۔ چناں چہ وہ مستعفی ہو کر مدرسۃ الاصلاح چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۶۲ میں چتر پور، ضلع ہزاری باغ میں واقع درس گاہ کاشف العلوم چلے گئے۔ ۱۹۶۴ میں اس کے بند ہو جانے پر آپ جامعۃ الفلاح تشریف لے آئے۔ مکتوب سوم اور چہارم دفتر الحسنات، رام پور کے پتے پر بھیجے گئے ہیں۔ ان پر تحریر مکتوب الیہ کا پتا مکتوب دوم پر تحریر پتے سے مختلف ہونے کی وجہ نامعلوم ہے۔

مکتوب چہارم بہت اہم اور مہتم بالشان ہے۔ اس کی بنیاد پر علمی دنیا کو مولانا جلیل احسن ندوی کی ایک نامکمل لیکن اہم علمی تصنیف ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' ❸ کی سوغات ملی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن' کے اجزاء ان کے ماہنامہ میثاق میں شائع ہو رہے تھے۔ اگست ۱۹۶۱ کے شمارے میں شائع شدہ تفسیری جزو میں مولانا ندوی نے بعض تفسیری تسامحات کی جانب مفسر گرامی کی توجہ دلاتے ہوئے ان کی تصحیح کی۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ تصحیح قبول کرتے ہوئے اسے اگلے شمارے میں شائع کر دینے کی بات لکھی۔ اس سے آگے بڑھ کر، از رہ علم پروری انہوں نے لکھا کہ 'میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس قسم کی چیزوں پر نگاہ رکھیں اور مجھے ان سے مطلع کرتے رہیں۔' چناں چہ مولانا امین اصلاحی صاحب کی اس 'بلا طلب اجازت' پر مولانا جلیل احسن ندوی نے تفسیر کا گہری نظر سے جائزہ لینا شروع کیا جس کے نتائج بالاقساط ماہنامہ 'زندگی' رام پور میں شائع ہوتے رہے۔ مصنفؒ مقدمہ

میں رقم طراز ہیں: 'میں تدبر قرآن پر نظرات نہ لکھتا اگر انہوں نے بلاطلب اجازت نہ دی ہوتی۔' (تدبر قرآن پر ایک نظر، ص: ۱۰)۔ان نظرات کی اشاعت کا علمی حلقوں میں استقبال کیا گیا، تاہم بعض گوشوں سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوا، کہیں زیرلب تو کہیں ناروالب و لہجے میں۔معترضین خاموش اس وقت ہوئے جب انہیں علم ہوا کہ جو کچھ مولانا ندوی نے تحریر کیا ہے اس میں ان کی 'اپنی رائے کا حصہ بہت کم ہے، مولانا اختر احسن رحمہ اللہ کا فیضان زیادہ ہے۔' ❹ (حوالۂ سابق، ص: ۸)۔ردعمل کی یہ نفسیات افسوس ناک اور بہرصورت علمیت کے منافی ہے۔ پسندیدہ افراد و شخصیات سے محبت اور عقیدت مندی اپنی جگہ، لیکن اسے علمیت کا حجاب بنا دینا، فکر و فہم کو جمود کی کال کوٹھری میں بند کر دینا ہے۔مولانا اصلاحی نے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں قرآن فہمی میں کھپا دیں اور علمی دنیا کو اپنے نتائج فکر کا ارمغان 'تدبر قرآن' کی صورت میں پیش کیا۔مولانا ندوی بھی اسی مدرسۂ قرآنی کے فیض یافتہ تھے جس کے مولانا اصلاحی تھے۔انہوں نے جہاں بھی محسوس کیا کہ یہاں مولانا اصلاحی کا قلم صحیح تعبیر پیش کرنے سے قاصر رہا، اس کی نشاندہی کر دی۔مولانا اصلاحی کے مکتوب کی روشنی میں یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ان نظرات کا کھلے دل سے استقبال کیا ہوگا۔ان سے اتفاق یا عدم اتفاق ایک دوسری بات ہے۔ہم خیال و ہم فکر حلقوں سے آنے والی تنقیدیں بالعموم مثبت اور تعمیری ہوتی ہیں اور فکر و نظر کے نئے دریچے کھولتی ہیں۔ان کا کھلے دل سے استقبال کیا جانا چاہیے۔

❖❖❖

حواشی

❶ حکیم مختار احمد اصلاحی (م ۲۰۰۶) کے نام ایک مکتوب میں مولانا نے تحریر کیا: ''پانچ شوال کو مدرسہ کھل جائے گا اور میں مدرسہ ان شاء اللہ پہنچ جاؤں گا۔ ۲۵ / رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ، ۵/ اکتوبر ۱۹۴۳ء۔(تدبر مکاتیب اصلاحی نمبر، ص: ۹۰)، [حسابی قاعدے سے ۲۵ رمضان ۱۳۶۲ ہجری ۲۴/ستمبر ۱۹۴۳ بنتی ہے]

❷ ایک معتبر اہل قلم نے لطیف پیرایۂ طنز میں مولانا اصلاحی کے مدرسہ چھوڑ کر پٹھان کوٹ جانے کا تذکرہ اس طرح کیا ہے: 'جب مولانا مودودی نے اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے بعض جگہوں کا سفر کیا تو وہ سرائمیر بھی تشریف لائے، اور بالآخر فکر حمید کے سب سے بڑے داعی و شارح بھی ان کے مکمل ہمنوا ہو گئے اور وہ وقت بھی آ پہنچا کہ استاد کا آستانہ چھوڑ کر پٹھان کوٹ جو مولانا مودودی کا مرکز و مستقر تھا، جا پہنچے۔ جب

مدرسۃ الاصلاح کی حدود سے وہ باہر نکل رہے ہوں گے تو کارکنانِ قضاوقدر نے یہ صدا ضرور بلند کی ہوگی کہ 'تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے'،

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

تو بھرِ تماشہ کجا می روی

مگر ایسے جوش کے عالم میں ہوش کی باتوں پر کون کان دھرتا ہے۔' (معارف، ص: ۵۹-۶۰)۔ فاضل مقالہ نگار کو شاید یاد نہیں رہا کہ اسی طرح کی حسرت ناک صورت حال سے تو خود دارالمصنفین اور معارف کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔

❸ مولانا جلیل احسن ندوی، تدبر قرآن پر ایک نظر، ترتیب وتعلیق: مولانا نعیم الدین اصلاحی، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح، ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء

❹ مولانا اختر احسن اصلاحی کے لیے دیکھیے: محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، شیدائے قرآن- مولانا اختر احسن اصلاحی، ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، دہلی۔ 'مولانا [اختر احسن اصلاحی] کی قرآن فہمی اور تحریک سے وابستگی'، حیاتِ نو (تحریک اسلامی ہند کی انقلابی شخصیات نمبر) فروری-مارچ ۱۹۸۱، ص: ۳۸-۵۰

....

کتابیات

- امین احسن اصلاحی: حقیقت شرک وتوحید، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۱
- جلیل احسن ندوی: تدبر قرآن پر ایک نظر، ترتیب وتعلیق: مولانا نعیم الدین اصلاحی، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح، ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶، نقوش وتاثرات، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح، باراول، ۱۴۱۰ھ
- رفیع الدین ہاشمی اور سلیم منصور خالد (مرتبین): خطوط مودودی-حصہ اول، طبع دوم، فروری ۲۰۱۱، خطوط مودودی-حصہ دوم، طبع اول، ۱۹۹۵، منشورات لاہور،
- تدبر مکاتیب اصلاحی نمبر، شمارہ ۱۶، جولائی ۱۹۹۸، ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور
- سہ ماہی نظام القرآن، ستمبر-نومبر ۲۰۰۴، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر
- ششماہی علوم القرآن (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر)، جنوری ۱۹۹۸ تا دسمبر ۲۰۰۰، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ
- ماہ نامہ ترجمان القرآن، مارچ واپریل ۱۹۴۴، نومبر ۱۹۹۴، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور
- ماہ نامہ حیات نو اگست ۱۹۹۸، ستمبر ۱۹۹۹، اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۲ (ہمارے اساتذہ)، انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
- ماہ نامہ معارف، جنوری ۱۹۹۸، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

حمد باری تعالی

اے ذات حق تعالیٰ، اے مالکِ حقیقی
ہے شان تیری یکتا، اے مالکِ حقیقی
ہر چیز سے عیاں تو، ہر چیز میں نہاں تو
ہر سو ہے تیرا جلوہ، اے مالکِ حقیقی
تو خالقِ جہاں ہے، تو مالکِ جہاں ہے
واجب ہے شکر تیرا، اے مالکِ حقیقی
یکتا ہے ذات تیری، وحدت ہے شان تیری
تیری صفات اعلیٰ، اے مالکِ حقیقی
تیری ثنا میں آخر، اس کے سوا کہوں کیا
تو صبح کا اجالا، اے مالکِ حقیقی
بس آرزو یہی ہے، جب وقتِ مرگ آئے
لب پہ ہو نام تیرا، اے مالکِ حقیقی
اپنی نوازشوں سے، اخلاص اس میں بھر دے
خالی ہے دل کا کاسہ، اے مالکِ حقیقی
بھارت کے بتکدوں میں، ظلمات کے نگر میں
گونجے ترا ترانہ، اے مالکِ حقیقی
اسلام کی صدائیں، ہر سو جہاں میں گونجیں
راشدؔ کی ہے تمنا، اے مالکِ حقیقی

سید راشد حامدی، نئی دہلی

شب جور و ستم ہوگی فرار آہستہ آہستہ

(یہ نظم جناب مولانا مطیع الرحمٰن نظامیؒ سابق امیر بنگلہ دیش جماعت اسلامی کی شہادت پر لکھی گئی)

شب جوروستم ہوگی فرار آہستہ آہستہ
چمن میں دیں کے آئے گی بہار آہستہ آہستہ
چمن کے مالیوں نے ظلم کی جو طرح ڈالی ہے
انھیں کھلوائے گی قدرت کی مار آہستہ آہستہ
ذرا تاریخ اسلامی پہ تو غائر نظر ڈالو
ہوئی غالب سدا حق کی پکار آہستہ آہستہ
ثبات وصبر ہو تو مشکلیں کافور ہوجائیں
لگیں چلنے ہوائیں سازگار آہستہ آہستہ
طلوع صبح ہوگی جلد ہی اے قافلے والو
رداء ظلمت کی ہوگی تار تار آہستہ آہستہ
خدا کی رحمتیں پیہم ہوں ملّاؔ(۱) اور نظامیؔ(۲) پر
چمن ہوگا انھیں سے مرغزار آہستہ آہستہ
حسینہ اب تو پاداش عمل سے بچ نہ پائے گی
تجھے لے ڈوبے گا تیرا خمار آہستہ آہستہ
شہیدانِ وفا کا خوں نہ ہوگا رائیگاں عارفؔ
یقیناً ہوگی ظالم ہی کی ہار آہستہ آہستہ

حافظ احسان الحق عارف آئمی، جامعۃ الفلاح

(۱) ملا سے مراد عبدالقادر ملا شہید (۲) نظامی سے مراد مولانا مطیع الرحمٰن نظامی

غزل

آئیں گے نظر صبح کے آثار میں ہم لوگ
بیٹھے ہیں ابھی پردۂ اسرار میں ہم لوگ

لائے گئے پہلے تو سرِ دشتِ اجازت
مارے گئے پھر وادیِ انکار میں ہم لوگ

اک منظرِ حیرت میں فنا ہوگئیں آنکھیں
آئے تھے کسی موسمِ دیدار میں ہم لوگ

ہر رنگ ہمارا ہے، ہر اک رنگ میں ہم ہیں
تصویر ہوئے وقت کی رفتار میں ہم لوگ

یہ خاک نشینی ہے بہت، ظلِّ الٰہی!
جچتے ہی نہیں جبّہ و دستار میں ہم لوگ

اب یوں ہے کہ اک شخص کا ماتم ہے مسلسل
چنوائے گئے ہجر کی دیوار میں ہم لوگ

سنتے تھے کہ بکتے ہیں یہاں خواب سنہرے
پھرتے ہیں ترے شہر کے بازار میں ہم لوگ

عزیز نبیل،قطر

تعارف وتبصرہ

اپنی شخصیت خود بنائیں(رہنمائے طلبۂ مدارس)

مصنف: محی الدین غازی

صفحات: 64

قیمت: 20/روپے

ناشر: وہائٹ ہاؤس پبلشر، D-300، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلائی دہلی-25

مبصر: ڈاکٹر وارث مظہری، اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مدارس کے طلبہ میں غیر معمولی قوت کار (Potential) پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود مدارس کا نصاب ونظام ہے۔ دین اور معاشرے کی خدمت کا جو عملی جذبہ مدارس کے فضلا میں پایا جاتا ہے، اس کی مثالیں دوسرے طبقات میں کم نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثال کے طور پر آزادی کے بعد جو بھی دینی وسماجی تحریکات اور تنظیمیں ملک کے طول وعرض وجود میں آئیں ان میں صف اول میں دینی مدارس کے فضلا کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ برصغیر کے دوسرے ممالک میں بھی فضلائے مدارس کا سماجی کردار اسی طرح نمایاں نظر آتا ہے۔

البتہ اس میں شک کی گنجائش نہیں اور اس کا اعتراف اہل دانش وبصیرت کو بجا طور پر ہے کہ ادھر دہائیوں سے فضلائے مدارس کا طبقہ محدودیت کا شکار ہوکر رہ گیا ہے۔ اس کی متعدد وجوہات میں سے ایک وجہ مدارس کے نصاب ونظام کی بعض کمزوریوں کے ساتھ فضلائے مدارس کے فکری افق کی تنگی اور ان میں پائی جانے والی بے حوصلگی ہے۔ مدارس میں بالعموم نصاب تو پڑھا دیا جاتا ہے لیکن طلبہ کی شخصیت کی مجموعی حیثیت سے تعمیر وتشکیل پر توجہ نہیں دی جاتی۔ چنانچہ صرف وہی طلبہ اپنی 'مکمل فکری وعملی' شخصیت کے ساتھ مدارس کی چہار دیواری سے نکل کر میدان عمل میں سرگرم ہوتے ہیں، جن کے اندر تعلیمی دورانیے میں خود اپنی شخصیت کی تعمیر کی دھن پیدا ہوگئی ہو۔

زیر نظر کتاب اس لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں طلبۂ مدارس کی جامع شخصیت کا

ایک عمدہ نقشہ اور رہنما خاکہ نکات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔طلبۂ مدارس ان اصولی اور عملی نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی شخصیت سازی کے عمل کو متوقع انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔اس تعلق سے کتاب میں سلف صالحین کی زندگیوں کے ان نقوش کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جن کی پیروی کے بغیر مدارس کی موجودہ نسلیں کارگہ حیات میں اپنی حیثیت منوانے اور متوقع کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوسکتیں۔

''پرسنالٹی ڈیولپمنٹ'' کو معاصر عملی وتربیتی حلقوں میں ایک فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔بہت سی تجارتی کمپنیاں اس کی ماہر شخصیات کو اپنے یہاں مدعو کرتیں اور اپنے ملازمین کو اس کے تربیتی کورسس سے گزارتی ہیں، جس کا فائدہ ملازمین کی قوتِ کار اور قوتِ انتاج میں اضافے کی شکل میں انہیں حاصل ہوتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے کورس چندروزہ ورک شاپ کی شکل میں مدارس میں چلائے جائیں۔جنوبی ہند کے بعض مدارس نے حالیہ دنوں میں اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا بھی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ان تمام ضروری نکات کا ایک خلاصہ مختصر صفحات میں طلبہ کے روبرو لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی درجنوں کتابوں اور پیش کیے گئے محاضروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔یہ کتاب اس لائق ہے کہ مدرسے کے ہر ہر طالب علم کی نگاہ سے گزرے۔

مصنف محترم کی یہ عملی کاوش ہر اعتبار سے لائق تحسین وستائش ہے۔وہ خود ایک دینی مدرسے کے فاضل ہیں۔اس لیے مدارس کے طلبہ کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ان کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔امید ہے کہ اس کتابچے کو مدارس کے حلقوں میں خصوصی پذیرائی حاصل ہوگی۔

تحفہ اقبال برائے اطفال

مصنفہ (شارح): نصرت شمسی،

صفحات:54، **قیمت** :100 روپے، **اشاعت**:2014،

ناشر :نصرت شمسی انجمن اسٹریٹ رام پور، یوپی۔244901، اسلامک ونڈرس بیورو 2660، کوچہ چیلان دریا گنج، نئی دہلی۔6

تبصرہ:سعید اختر اعظمی

شاہین کے توسط سے فلسفہ خودی پیش کرنے والے علامہ اقبال نے نسل نو کے ہر فرد تک اپنے پیغام کی ترسیل کی۔ان کا جذب دروں مغربی تہذیب سے بیزاری اور مشرقیت سے ہم آغوشی کا غماز ہے۔

اگر چہ انھوں نے بچوں کے لیے خاصا کم لکھا ہے مگر جو لکھا ہے اس میں مقصدیت کی تحریک نمایاں ہے۔ ننھے ذہنوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی منظومات اقبال میں سے بیشتر کا خیال انگریزی شاعری سے مستعار ہے۔ بہرکیف جنت کے پھولوں کی خاطر لکھی گئی ہوں یا انھیں مرکز بنایا گیا ہو مقصد ایک ہی ہے کہ وہ فعال اور متحرک ہوں۔ تفہیم شعر اقبال کے بحر عمیق میں غوطہ زن رہنے والوں نے مفاہیم کے گوہر آبدار تلاش کیے اور متلاشیان کے ذوق کی تسکین کی۔

اقبال کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے انتخاب اور شرح ووضاحت پر مشتمل کتابی سلسلہ برصغیر میں گزشتہ کئی برسوں سے جاری وساری ہے۔ نصرت شمسی کا تحفہ اقبال برائے اطفال اسی سلسلہ کی تازہ کڑی ہے۔ اس میں 8 نظموں (بچے کی دعا، ہمدردی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑا اور مکھی، پرندے کی فریاد، ایک گائے اور بکری، ماں کا خواب، ترانہ ہندی) کو ادب اطفال کے حوالے سے امتیازی حیثیت دی گئی ہے۔ عہد جدید میں جبکہ انگریزی نظموں کا دور دورہ ہے نصرت شمسی کا یہ خیال یقیناً خوش آئند ہے کہ اردو میں بچوں کی نظمیں جو کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں ہیں آسان زبان اور نئے انداز میں ان تک پہنچیں اور پیام اقبال عام ہو۔ چونکہ انھوں نے ماں کی شفیق آغوش میں سمٹ کر ان کی زبانی قرأت کا سرور روح میں اترتا ہوا محسوس کیا ہے اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ نئی نسل کا ذہن بھی اسی جذب وسرمستی میں ڈوبا رہے۔

نظموں سے قبل انھوں نے جو تمہیدی کلمات اور پس منظر بیان کیا ہے ان میں والہانہ پن جھلکتا ہے۔ 'بچے کی دعا' میں علم سے الفت، مجبوروں اور بے کسوں سے محبت نیز انسانیت کی خدمت کا درس ہے تو 'ہمدردی' میں ایک دوسرے کے کام آنے کی نصیحت۔ 'ایک پہاڑ اور گلہری' میں صناعی قدرت کے لاجواب ہونے کی جانب اشارہ ہے تو 'ایک مکڑا اور مکھی' میں خوشامد اور جھوٹی تعریف کے بہکاوے میں آنے والوں کا انجام بد۔ 'پرندے کی فریاد' آزادی کی نعمت عظمی کا احساس ہے تو 'ایک گائے اور ایک بکری' احسان کی قدر ومنزلت۔ 'ترانہ ہندی' میں وطن عزیز سے محبت کی ترغیب ہے تو 'ماں کا خواب' میں نالہ وشیون سے گریز۔

مؤخر الذکر نظم ایک ماں کا کرب ہے جس کا بچہ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ وہ اسے یاد کر کے ہر وقت روتی رہتی تھی۔ عالم بیداری ہو یا عالم خواب ہر طرف وہی نظر آتا۔ ایک بار ماں نے خواب میں دیکھا کہ اندھیری رات میں قطار بند لڑکے چلے جا رہے ہیں جن کے ہاتھوں میں شمع فروزاں ہے۔ ابھی وہ اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ قطار کے آخر میں وہ افسردہ سا دکھائی دیا۔ جانے کیوں اس کا

چراغ بجھا ہوا تھا۔ ماں نے جب اس کا سبب پوچھا تو بیٹے نے جواب دیا۔ ’تجھے میری جدائی رلاتی ہے مگر اس سے میرا ہرگز بھلا نہیں ہوتا۔ اس دیے کے بجھنے کا سبب کچھ اور نہیں صرف تمھارے آنسو ہیں‘۔ تمام شارحین اسی شرح پہ متفق ہیں۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور اور ایم ایم پبلی کیشنز دہلی سے شائع شدہ شرح بانگ درا میں ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی یوں رقم طراز ہیں۔ ’اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مرنے والے کی جدائی میں بے قرار و بے چین ہونے کے بجائے اس کی روح کو ثواب پہنچانے کا کام کرنا چاہیے۔ اس طرح رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل محبت یہ ہے کہ میری روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کچھ کیا کر، کچھ پڑھا کر‘۔

اس عمومی تشریح کے علی الرغم ماہنامہ شاعر کی دریافت اسنی بدر ایک الگ ہی خیال پیش کرتی ہیں۔ ’اس نظم سے یہ سبق ملتا ہے کہ ماں باپ کا بے جا لاڈ پیار بچوں کی کامیابی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ماں کا بیٹا اس کے بے جا لاڈ و پیار سے اکتا کر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس لیے جدائی کے غم میں ماں بے چین و بے قرار ہے۔ دراصل لڑکے کی ماں اپنے بیٹے کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے خود سے جدا کر کے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہیں بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی ناجائز محبت اور آنسوؤں نے لڑکے کے ہاتھ کا چراغ بجھا دیا‘۔ اس کج فہمی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

نصرت شمسی نے یہاں جن نظموں کا ذکر کیا ہے ان میں ترانہ ملی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، جگنو، ایک پرندہ اور جگنو کو بھی شامل کر لیا جاتا تو سونے پہ سہاگہ ہوتا۔ علامہ اقبال نے بچپن، نوزائیدہ بچے اور نفسیات اطفال کے حوالے سے ’عہد طفلی، طفل شیر خوار، بچہ اور شمع‘ لکھی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ان کی تشریح و توضیح کو بھی جزو کتاب بنا لیا جاتا۔

آپ کے خطوط

عمر افضل، امریکہ

عزیزم ابوالاعلی سبحانی صاحب تازہ حیات نو کے لیے بہت بہت شکریہ۔

ماشاء اللہ آپ کی کوششوں سے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ حیات نو میں اچھے اور مفید مضامین ہوتے ہیں۔ جامعہ کی تعمیر وترقی سے متعلق کافی کچھ واقفیت حاصل کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔

کام جاری رکھیے، اللہ برکت دے گا۔ برادرم امانت اللہ اصلاحی صاحب اور دوسرے بہی خواہوں کو سلام عرض کیجیے۔

رضوان احمد فلاحی، لندن

دسمبر 2016 کا شمارہ موصول ہوا، بہت بہت شکریہ۔

آپ نے اداریہ کے آخر میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ بہت اہم اور فکر انگیز ہیں۔ جامعہ اور انجمن کے ذمہ داروں کو ان پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ اگر جامعہ کا تدریسی عملہ جامعہ کی فکری اساس سے خود کو ہم آہنگ نہ کرسکے تو زیر تربیت طلبہ کی اس کے مطابق تربیت کیسے کرسکے گا۔ اس محاذ پر مستقل چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ حفیظ میرٹھی صاحب بہت پہلے متنبہ کرگئے ہیں:

قافلہ چاہے مختصر ہوجائے　　　کوئی رہزن نہ ہم سفر ہوجائے

ڈاکٹر محی الدین غازی کا مضمون 'اردو تراجم قرآن پر ایک نظر'، سابقہ قسطوں کی طرح معیاری ہے۔ مجھے اس کے مکمل ہوکر کتابی شکل میں آنے کا انتظار ہے۔ ترانہ فلاح پر ڈاکٹر امتیاز وحید کے مضمون کی اٹھان اچھی ہے۔ 'اسلام کا تصور امن وانسانیت'، موضوع اچھا ہے مضمون کی ابتدا بھی اچھی ہے، لیکن آگے چل کر یہ آہنگ برقرار نہیں رہ سکا۔ نیز اقتباسات بھی بلا حوالے نقل کردیے گئے ہیں۔ توجہ اور نظر ثانی سے معیار بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

کیفی اعظمی پر مضمون ان کی شخصیت اور فکر وفن پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مضمون نگار کے جذبۂ

عقیدت مندی کے زیریں تموج کا احساس بھی دلاتا ہے۔ایک نظریاتی جریدے میں منفی 180 درجے نظریے کے علمبردار کا ستائشی تذکرہ بھی خوب ہے۔موصوف کی انگلش پر اردو جیسی یکساں قدرت کا پڑھ کر ذہن ایک واقعہ کی طرف چلا گیا۔کیفی صاحب کی صاحبزادی کا انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ ہونا تھا۔داخلہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ امیدوار طالب علم کے والدین کو بھی انگلش آنی چاہیے کیونکہ ان کا انٹرویو انگلش ہی میں ہوتا۔کیفی صاحب اوران کی اہلیہ یہ شرط پوری کرنے سے قاصر تھے۔چنانچہ ان کے ایک ہندو دوست اوران کی اہلیہ نے 'انگریزی گو' والدین بن کران کی مشکل آسان کی۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ایک دلچسپ واقعہ اور۔

کیفی صاحب کا جب اپنے گاؤں، مجواء، میں مستقل قیام رہنے لگا تو ہمارے اور ان کے ایک مشترکہ جاننے والے نے ایک مرتبہ ان سے کہا: کیفی صاحب، کیا آپ کے علم میں ہے کہ متصل قصبہ پھول پور میں ایک بہت بڑے اور مشہور مصنف رہتے ہیں۔انہوں نے پوچھا کون؟ بتایا گیا: مولانا صدرالدین اصلاحی۔کہنے لگے: لاؤ ان کی کوئی تحریر دو پڑھنے کو۔انہوں نے ان کو زندگی کوئی شمارہ دیا جس میں مولانا کا مضمون تھا۔کچھ دنوں بعد کیفی صاحب نے اسے واپس کرتے ہوئے کہا: یہ مولوی صاحب تو چودہ سو سال پہلے کی باتیں کرتے ہیں۔کچھ عرصے کے بعد میں نے سرائمیر میں ایک محفل میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔اس میں مدرسۃ الاصلاح کے استاد مولوی انیس اصلاحی صاحب بھی موجود تھے جنہیں شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔انہوں نے بتایا کہ چندروز قبل وہ اور سرائمیر سے ہی تعلق رکھنے والے رشید انصاری، کیفی صاحب سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔دوران گفتگو مولانا صدرالدین صاحب کا ذکر آیا تو کیفی صاحب نے کہا: میں نے ان کی تحریر دیکھی ہے۔وہ بہت اعلی پائے کی معیاری نثر لکھتے ہیں۔کاش میں ان جیسی نثر لکھ سکتا۔

مسلم پرسنل لا پر 'حیات نو' نے اچھے مباحثے کا اہتمام کیا اور اس پر مختلف انداز سے خیالات سامنے آئے۔شرکاء نے جامع انداز سے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ضمیر الحسن خاں فلاحی اور ڈاکٹر صلاح الدین ایوب کی تحریریں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔مؤخرالذکر کے مضمون میں انگلش الفاظ آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔

گزشتہ کسی شمارے میں "فیصلے لیے گئے" جیسی نامانوس ترکیب نظر سے گزری تھی۔فیصلہ لینا انگلش کے to take decision کا لفظی ترجمہ ہے۔اردو میں اس کا بامحاورہ ترجمہ فیصلہ کرنا ہے۔مروج اور مانوس ترکیب چھوڑ کر نامانوس ترکیب اختیار کرنا صحیح اردو نہیں ہے۔حیات نو کے مقاصد میں صحیح

اور بامحاورہ اردو کی ترویج بھی شامل رہنی چاہیے۔اسی طرح 'شیئر کرنے' کی بدعت بھی بڑی تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔حالاں کہ 'شریک کرنے' سے تشفی ہوجانی چاہیے۔

فرحین اسرار فلاحی، جیراجپوراعظم گڑھ

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں تھیں جو کہ پنہاں ہوگئیں

اس صفحہ ارضی پر نہ جانے کتنے انسان آئے لیکن ہر ایک کے حصے میں کمال کہاں آتا ہے۔ چند لوگوں کے اندر وہ فطری کمال اور اوصاف ہوتے ہیں جو اپنا لوہا منوائے بغیر اس فانی دنیا سے نہیں جاتے بلکہ وہ اپنا نقش عالم انسانیت کے دل ودماغ پر شعوری طور پر بیٹھا کر جاتے ہیں۔انہیں فطری کمالات سے یاد کرنے والے اَن گنت لوگ ہوتے ہیں،اسی صف میں کیفی اعظمی بھی ہیں۔

وصف باکمالوں کا کب چھپا چھپانے سے
فن اگر مکمل ہو بولتی ہیں تصویریں

الحمدللہ برادرم ڈاکٹر محمد افضل فلاحی رکن شوری جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے اپنے نوکِ قلم سے صفحہ قرطاس پر ان کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کو انتہائی خوبصورت انداز اور اختصار کے ساتھ ادبی انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے ان کی زندگی کے تمام روشن پہلو روز روشن کی طرح عیاں ہوگئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ڈاکٹر افضل فلاحی کا ایک مضمون ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' حیات نو میں شائع ہوا تھا،اس وقت بھی کچھ لکھنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت نے ساتھ نہیں دیا،لیکن یہ مضمون پڑھ کو قلم کو نہ روک سکی۔موصوف کا انداز تحریر اتنا جاذب لگا کہ بار بار پڑھا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے''۔اسلوب تحریر میں ادب کا بانکپن بھی ہے اور شعری ذوق بھی،کسی شخصیت کے خدوخال کو نہایت عمدہ انداز وپیرائے میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی۔اشارات وکنایات اور تشبیہات کا استعمال بڑی ہی خوش اسلوبی سے کیا ہے اور پورا مضمون نگینہ سے مرصع نظر آتا ہے۔لیکن ایک جگہ باغیانہ ذہن اور باغی جیسے الفاظ اس قلب حزیں پر مناسب نہیں معلوم ہوئے، بلکہ اس کی جگہ حقیقت پسندانہ اور حق پرستی اور حق گوئی جیسے الفاظ زیادہ مناسب تھے۔بہر حال مجموعی لحاظ سے پورا مضمون بہت ہی عمدہ ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

ادارۂ علوم القرآن کی جانب سے جامعہ میں درس قرآن کا مسابقہ

۲۳/ نومبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ بعد نماز عشاء جامعہ کی مسجد میں درس قرآن کا مسابقہ ادارۂ علوم القرآن کی جانب سے جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے تعارفی گفتگو میں فرمایا کہ یہ مبارک محفل ہے۔ قرآن کی دعوت کو ہمیں تمام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ برادران ملت اور برادران وطن تک دعوت پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے۔ مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کا امتیاز قرآنی فکر ہے اس لیے اس جانب خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جناب ڈاکٹر سکندر اصلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں مسابقہ کے شرائط وضوابط کا ذکر کیا۔ اس مسابقہ میں شریک طلبہ کی فہرست کچھ اس طرح ہے: توصیف اختر (فضیلت سال دوم)، نبیل احمد (فضیلت سال اول)، محمد ابراہیم خان (فضیلت سال اول)، مصیب الحق (عربی پنجم)، وقار احمد بٹ (عربی پنجم)، محمد اشرف (عربی پنجم)، عبدالقادر (عربی پنجم)، شاہ زیب (فضیلت سال دوم) مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صرف آٹھ طلبہ کی مسابقہ میں شرکت پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس مسابقہ میں چار سورتوں (سورہ بقرہ، مائدہ، مومنون اور سورہ صف) کی منتخب آیات کا درس پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہر شریک کو دو دو صفحہ کا نوٹ پیش کرنا لازمی تھا۔ اسی طرح اس مسابقہ کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ایک حدیث متن کے ساتھ اور علامہ فراہی کا نقطۂ نظر بھی پیش کرنا لازمی تھا۔ حکم کے فرائض جناب مولانا سکندر علی اصلاحی صاحب، جناب ذکی الرحمٰن غازی فلاحی صاحب اور جناب مولانا اقبال احمد اصلاحی ندوی صاحب نے انجام دیئے۔

۲۴/ نومبر بروز پنج شنبہ ابواللیث ہال میں ایک انعامی تقریب منعقد ہوئی۔ درس قرآن کے مقابلے میں شرکت کرنے والے تمام طلبہ کو تشجیعی انعامات سے نوازا گیا اور اس مسابقے میں مصیب الحق (اول) شاہ زیب (دوم)، محمد ابراہیم خان (سوم) پوزیشن حاصل کی۔ اخیر میں مولانا انیس احمد مدنی صاحب نے

فرمایا کہ بار بار ددہانی کے باوجود اس مسابقے میں بہت کم طلبہ نے شرکت کی یہ ہمارے لیے باعث افسوس ہے۔ یہ مسابقہ ایک ٹریننگ ہے آئندہ اس طرح کے مسابقوں میں طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

جناب سعید احمد صاحب (پونہ) کا لکچر

۲۵/نومبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں جناب سعید احمد صاحب، پونہ کی جامعہ آمد پر ایک پروگرام منعقد ہوا، ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ نے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے اور سینکڑوں لکچرس دیے ہیں، آپ طلبہ کے اندر تعلیم کے لیے شوق پیدا کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی جناب سعید احمد صاحب (پونہ) نے فرمایا کہ تعلیم کے بعد لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ سعودی عرب چلے جائیں گے یا مزید تعلیم حاصل کریں گے یہ تو ایک روٹین ہے۔ ہماری سوچ یہ ہونی چاہیے کہ ہم کچھ نیا کریں، کچھ الگ کریں، اپنا مقام پیدا کریں، ہمارا ایک واضح مشن ہو، ہمارا ایک واضح نظریہ ہو۔ جب تک آپ اپنے کو قیمتی نہیں بنائیں گے دنیا آپ کا استحصال کرتی رہے گی۔ ناظم جامعہ نے اخیر میں اعلان کیا کہ جو طلبہ ٹریز بننا چاہتے ہیں وہ درخواست دیں، دس پندرہ دن کا ان شاء اللہ ایک ورکشاپ رکھا جائے گا لیکن سنجیدگی سے سوچ کر درخواست دیں۔

جامعہ میں ایس آئی او کا دو روزہ ممبرس کیمپ

۲۶-۲۷/نومبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ ویکشنبہ جامعہ کی مرکزی لائبریری ہال میں ایس آئی او یوپی مشرق کا دو روزہ ممبر کیمپ کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی کلمات جناب محمد رافع (سکریٹری حلقہ، یوپی مشرق) نے پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا کام بامقصد ہونا چاہیے اور ہر وقت ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ بدلتے ہوئے حالات میں تزکیہ فکر وعمل کے موضوع پر جناب خان یاسر (ممبر مرکزی مجلس شوریٰ ایس آئی او آف انڈیا) نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اخوان المسلمون کی جس وقت تاسیس ہوئی اس وقت حالات دوسرے تھے جیسے جیسے حالات بدلتے گئے اخوان کی پالیسی بدلتی گئی اسی طرح وقت اور حالات کو سامنے رکھ کر اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں۔ جناب محمد ابراہیم (فلاح یونٹ) نے ''اقامت دین: ایک فریضہ'' کا حاصل مطالعہ پیش کیا۔ اس کے بعد ''فکر مودودی'': ایک جائزہ''، جناب خان یاسر (ممبر مرکزی مجلس شوریٰ) اور ''ایس آئی او: ایک نظریہ ایک مستقبل'' کے عنوان پر جناب محمد شاداب (سکریٹری حلقہ، دہلی) گفتگو کی۔ دوسرے سیشن میں دو خطاب ہوئے، جذبۂ قربانی کی اہمیت، جناب محمد نعیم (سرپرست حلقہ ایس آئی او، یوپی مشرق) قائدانہ صلاحیت اور کردار، جناب مولانا عتیق الرحمان

اصلاحی۔ تیسرے سیشن میں چار پروگرام ہوئے، عبادت میں حلاوت کیسے محسوس ہو؟ مولانا مطیع اللہ فلاحی مدنی (ناظم علاقہ گورکھپور)، اشوز کی سمجھ، اقدامات اور حل کی تدابیر، جناب خان یاسر صاحب (ممبر مرکزی مجلس شوریٰ ایس آئی او آف انڈیا)، زونل رپورٹ، جناب محمد رافع (سکریٹری حلقہ، یوپی مشرق) تحریک اقامت دین، ترجیحات و مراحل، خان یاسر صاحب (ممبر مرکزی مجلس شوریٰ)، چوتھا سیشن کلچرل پروگرام کا ہوا۔ ۲۷/نومبر بروز یک شنبہ بعد نماز فجر مولانا محمد عمران فلاحی صاحب (ناظم ضلع اعظم گڑھ) نے تذکیر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہر کام اخلاص کے ساتھ ہو، اللہ کی رضا و خوشنودی پیش نظر ہو، انتخاب انہی کا کریں جو ہر لحاظ سے بہتر ہوں۔ اس کے بعد انتخاب کی وضاحت سرپرست حلقہ یوپی مشرق جناب محمد نعیم صاحب نے کی۔ تنظیمی شعور: اہمیت اور تقاضے کے عنوان پر جناب خان یاسر (مرکزی مجلس شوریٰ) نے گفتگو کی۔ اس کے بعد عارض الیاس علوی (الہ آباد)، محمد اسجد (بستی)، ذوالقرنین حیدر سبحانی (بلریا گنج)، مسیح الزماں انصاری (دیوریا)، ابورافع (گورکھپور) کو ZAC کے لیے منتخب کیا گیا۔ مولانا مطیع اللہ فلاحی مدنی (ناظم علاقہ گورکھپور) کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

'بابری مسجد' پر خصوصی پروگرام

۶/دسمبر ۲۰۱۶ء بروز سہ شنبہ ابواللیث ہال میں بابری مسجد کے یوم شہادت پر ایک پروگرام منعقد ہوا۔ نائب صدر مدرس جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے بابری مسجد کی تاریخ کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، ہمیں اس کی بازیابی کی کوشش کرنی چاہیے۔ مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے گفتگو میں فرمایا زندہ قومیں اپنا احتساب کرتی ہیں، ہم اپنا اور اپنی تاریخ کا احتساب کریں۔ ہم زندہ قوم ہونے کا ثبوت پیش کریں تاکہ کامیابی سے ہمکنار ہوسکیں۔

جامعہ میں ششماہی امتحان اور تعطیل سرما

اس بار جامعہ میں ششماہی امتحان کا آغاز ۱۰/دسمبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ ہوا۔ ۲۳/دسمبر ۲۰۱۶ء بروز پنج شنبہ تک امتحان جاری رہے۔ اس کے بعد طلبہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے، اس بار تعطیل سرما گھٹا کر بیس دن کردی گئی۔ دوسری ششماہی کا آغاز ۱۴/جنوری ۲۰۱۷ء بروز شنبہ ہوا۔

جناب خبیب احمد کاظمی فلاحی کی جامعہ آمد

۱۹/جنوری ۲۰۱۷ء بروز پنج شنبہ ابواللیث ہال میں جناب مولانا خبیب احمد کاظمی فلاحی صاحب

(مقیم حال قطر) کی ایک مختصر تذکیر ہوئی۔ جناب مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی نے مہمان کا تعارف کرایا۔ جناب خبیب احمد کاظمی فلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ طلبہ اپنا وقت فضول چیزوں میں ضائع نہ کریں، خوب محنت سے پڑھیں، علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ عمل میں بھی اضافہ کی کوشش کریں، اچھے اخلاق وکردار کے حامل بنیں، اساتذہ کا احترام کریں، اپنی فکر کو مثبت انداز میں پروان چڑھائیں، یہی جامعہ آپ سے چاہتا ہے۔

یوم جمہوریہ کی مناسبت سے پروگرام

۲۶/جنوری ۲۰۱۷ء بروز پنج شنبہ ابواللیث ہال میں یوم جمہوریہ کی مناسبت سے ایک پروگرام منعقد ہوا۔ برادر محمد عمر نیپالی (فضیلت سال دوم) نے ''یوم جمہوریہ ہم کیوں منائیں؟'' کے عنوان پر گفتگو کی۔ محمد آصف بنارسی (عربی پنجم) نے دستور میں دیئے گئے حقوق پر گفتگو کی۔ جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے عنوان پر گفتگو کی۔ جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ آپ لوگ اپنا اپنا جائزہ لیں، ہندوستان کے جو حالات ہیں ان کے پیش نظر آپ کی کیا ذمہ داری بنتی ہے اس کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد حسن البنا، مودودی ہاسٹل کے سامنے والے پارک میں قومی پرچم ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے بدست لہرایا گیا۔ یوم جمہوریہ کی مناسبت سے جامعہ کے شعبہ حفظ، ثانوی وابتدائی میں بھی پروگرام منعقد کیے گئے۔

نگران اعلیٰ جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب کا طلبہ سے خطاب

۳۰/جنوری ۲۰۱۷ء بروز دوشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں نگران اعلیٰ جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب کی ایک تذکیر ہوئی، طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ طلبہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوں، تعلیمی ماحول بنائیں، کلاسوں کی مکمل پابندی کریں، روزانہ بلا ناغہ ہر مضمون کا مطالعہ کرکے کلاس جائیں، نمازوں کی خاص طور سے پابندی کریں، کسی کے پاس ملٹی میڈیا موبائل ہو تو نگراں آفس میں نام درج کراکے اپنا موبائل جمع کردیں، تعطیل میں گھر جاتے وقت موبائل واپس کردیا جائے گا، البتہ سادہ موبائل طلبہ رکھ سکتے ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں کوئی پریشانی ہو تو فوراً ہمیں باخبر کریں، ہم آپ کا ہر طرح سے تعاون کریں گے۔ لائبریری میں زیادہ وقت لگائیں، فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ اللہ نے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں اس کے لیے ہر طرح سے تیاری کریں۔ اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کریں۔ اللہ ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہو۔

حیات نو وقتی طور پر سہ ماہی کیا گیا

۲۶؍جنوری کو منعقد سکریٹریٹ انجمن طلبہ قدیم کی نشست میں انجمن کی مالی صورت حال اور دیگر امور کو مدنظر رکھتے ہوئے حیات نو کو وقتی طور پر سہ ماہی کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حتمی فیصلہ ۱۹؍مارچ کو انجمن کی شوریٰ کے اجلاس میں کیا جائے گا۔

میقات رواں کا پہلا شوریٰ اجلاس دہلی میں

انجمن کی میقات رواں کا پہلا اجلاس شوریٰ ۱۹؍مارچ کو دہلی میں منعقد کیا جائے گا۔ اس میں ارکان شوریٰ کے علاوہ مدعوئین خصوصی کی حیثیت سے بھی کچھ نمایاں فلاحی حضرات کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس نشست میں میقات کی ترجیحات کے علاوہ سال رواں کے سلسلے میں بھی منصوبہ بندی کی جائے گی۔

جامعۃ الفلاح کے وفد کا اعظم کیمپس پونے کا دورہ

(انجمن طلبہ قدیم ممبئی یونٹ کی رپورٹ) جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے اپنے ممبئی دورہ کے دوران اعظم کیمپس پونے کا بھی دورہ کیا اور مہاراشٹر میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے والی شخصیت پی اے انعامدار سے ملاقات کی۔

مولانا نے اعظم کیمپس میں جاری کمپیوٹر و تکنیکی تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر یہ نظام جامعۃ الفلاح میں بھی رائج ہو جائے تو نہ صرف مدرسے کے بچوں کی تعلیمی لیاقت میں اضافہ ہوگا بلکہ نئی نسل جدید تقاضوں سے آراستہ ہوگی لہٰذا اس کی کیا صورت ممکن ہے؟ جس کے جواب میں پی اے انعامدار نے کہا کہ ''جامعہ کو تکنیکی تعلیم سے آراستہ کرنا اب ہماری ذمہ داری ہے لہٰذا آپ جس طرح کی بھی معاونت چاہتے ہوں ہم اسے مہیا کرانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں''۔

جامعۃ الفلاح ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو تعلیم و تربیت کے میدان میں نصف صدی سے زائد عرصے سے نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے. قرآن وسنت کی محققانہ تعلیم، جدید و قدیم علوم کا بہترین امتزاج، دعوت دین اور اصلاح معاشرہ کے لیے باصلاحیت افراد کی تیاری، طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا نظم، فنی اور تکنیکی تعلیم پر بھی توجہ اور وسعت قلب ونظر کی افزائش جامعہ کے امتیازات شامل ہیں۔

پی اے انعامدار نے گفتگو کے دوران کہا کہ ''مدارس کو جدید سہولیات کے ساتھ تکنیکی تعلیم سے

آراستہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔کمپیوٹر اور انگلش کی تعلیم کے ذریعہ ہم مدارس کے بچوں کو جدید دنیا کے مطابق تیار کر سکتے ہیں جہاں وہ ایک اچھا داعی، اچھا تاجر اور اچھا انسان بن کر اپنی زندگی گذار سکتا ہے‘‘۔

واضح رہے کہ وفد میں ممبئی کی سماجی و تعلیمی شخصیات جن میں اقرأ گیان ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے روح رواں لیاقت علی خان، فیروس ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے سینئر سپر وائزر مولانا عبدالبر اثری فلاحی، سر سید گرلس کالج کے سربراہ محمد خالد مخدومی، جمال ایکسپورٹس کے مالک ادہم علی فلاحی کے ساتھ معیشت کے مینجنگ ڈائرکٹر دانش ریاض فلاحی بھی شامل تھے۔

وفیات

.........۲/ دسمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعرات ۳/ بجے ڈاکٹر آفتاب عالم فلاحی بن نور محمد فلاحی کے خسر جناب عبدالغنی صاحب فالج اٹیک کے نتیجے میں کئی روز کی علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ جامعہ میں عرصہ تک تعمیرات کے ذمہ دار رہے۔ آپ کی عمر تقریباً ۶۵/ سال تھی۔ نماز جنازہ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے پڑھائی۔ حسن پور کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور دو فلاحی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

............۱۰/ دسمبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ مولانا ابوالبقاء ندوی صاحب کی اہلیہ محترمہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ مرحومہ ۷۷ سال کی تھیں۔ ایک سال سے علیل چل رہی تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں، سب کو نماز کی تلقین کرتی تھیں۔ نماز جنازہ مولانا ابوالبقاء ندوی صاحب نے پڑھائی۔ اسی طرح مولانا کی بہو اور جناب اطہر صاحب کی اہلیہ بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں (اناللہ وانا الیہ راجعون) مرحومہ کی عمر پچاس سال تھی۔ اچانک دو دن بیمار رہیں اور مالک حقیقی سے جاملیں۔ دل کی مریضہ تھیں، اسی سال حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا۔ نماز جنازہ مولانا ابوالبقاء ندوی صاحب نے پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ دونوں ہی مرحومہ کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔(آمین)

............۱۰/ دسمبر ۲۰۱۶ء بروز شنبہ مولانا اظہار احمد فلاحی مدنی صاحب کی والدہ محترمہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) مرحومہ ۹۵ سال کی تھیں۔ کافی کمزور ہو چکی تھیں صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ نہایت اخلاق مند تھیں، گھر میں کسی کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ نماز جنازہ مولانا اظہار احمد مدنی صاحب نے پڑھائی۔ جامعہ سے متصل قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ

کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔(آمین)

.... برادر شمس نوید فلاحی فراغت ۱۹۸۸ء مقیم حیدرآباد کے والد محترم محمد سردار خان کا مختصر علالت کے بعد ۸فروری کو شہر حیدرآباد میں انتقال ہوگیا، ۹۵ سال کی عمر تھی، جماعت اسلامی ہند کے قدیم رکن تھے۔اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر کی توفیق دے آمین۔

.... برادر ندیم فلاحی کا ۷؍فروری کو تبوک، سعودی عرب میں اونچائی سے گر کر انتقال ہوگیا۔وہ روزگار کے لیے وہاں مقیم تھے۔اللہ تعالی انہیں جنت نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ندیم بمہور اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور ۱۹۹۱ء میں عالمیت کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے تھے۔

.... برادر شفیق عالم فلاحی، نیپال کا ایک طویل علالت کے بعد یکم فروری کو انتقال ہوگیا۔موصوف کافی سرگرم اور صلاحیت مند فلاحیوں میں سے تھے۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

............محترمہ قانتہ فلاحی صاحبہ سابق ہیڈ معلّمہ کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح کے شوہر اور ماسٹر جنید صاحب مرحوم سابق استاذ جامعۃ الفلاح کے داماد جناب پروفیسر صفدر سلطان اصلاحی صاحب ۱۸؍فروری بروز سنیچر علی گڑھ سے دہلی جاتے ہوئے ایک کار حادثے کے نتیجے میں مالک حقیقی سے جا ملے۔موصوف مرکز جماعت اسلامی ہند میں منعقد ادارہ تحقیق وتصنیف کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لا رہے تھے۔نماز جنازہ ۱۹؍فروری کو علی گڑھ میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری صاحب نے پڑھائی۔ پسماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

سکریٹری انجمن مولانا انعام اللہ فلاحی نے ادارہ حیات نو سے گفتگو کرتے ہوئے فلاحی برادران سے تمام ہی مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے دعائے صبر جمیل کی گزارش کی ہے۔اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین ثم آمین